بموقع: تحفظ سنت کانفرنس
(زیر اہتمام: جمعیت علماء ہند)

قرأت خلف الامام

صحیح بخاری میں پیش کردہ دلائل کی روشنی میں

افادات

فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ
سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

ترتیب

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری
استاد حدیث دار العلوم دیوبند

ناشر
جمعیۃ علماء ہند بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی

قرأت خلف الامام

صحیح بخاری میں پیش کردہ دلائل کی روشنی میں

افادات

فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ
سابق صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

ترتیب

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری
استاذ حدیث دار العلوم دیوبند

ناشر

جمعیۃ علماء ہند۔ ۱، بہادر شاہ ظفر مارگ نئی دہلی۔ ۲

پیش لفظ

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہٖ محمد و علی آلہٖ و صحبہٖ اجمعین۔ اما بعد!

اسلام پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے اللہ کا نازل کیا ہوا وہ قدیم دین ہے جو حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام پر بھی نازل کیا گیا تھا اور ان سب پیغمبروں کو دین کے قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تھا اور ان کے ذریعے تمام اہل ایمان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ دین میں اختلاف پیدا نہ کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ. (سورۃ الشوریٰ آیت ۱۳)

تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا نوحؑ کو تاکیدی حکم دیا گیا تھا اور جو وحی کے ذریعے آپؐ پر نازل کیا گیا ہے اور جس کا تاکیدی حکم ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ اندازی نہ کرو۔

چنانچہ اصولِ دین اور مقاصدِ شریعت میں تمام انبیاء اور ان کے آسمانی مذاہب میں اتحاد ہے، توحید، الوہیت، رسالت، بعث ونشر وغیرہ پر ایمان لانا ہمارے لیے بھی ضروری ہے اور امم سابقہ پر بھی ضروری تھا، اسی طرح صدق، امانت، عبادت، احسان، عدل اور سخاوت وغیرہ کا ان کو بھی حکم دیا گیا اور امتِ محمدیہ بھی ان احکام کی پابند ہے، لیکن مقاصد شریعت کے حصول کے طریقوں میں اختلاف ہوسکتا ہے، بلکہ ہوتا ہے کہ ہر امت کو اس کے زمانے اور اس کی استعداد کے مطابق تعمیل احکام کی ہدایت دی گئیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

لكل جعلنا منكم شرعة و منها جا. ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے آئین اور طریق عمل مقرر کیا ہے۔ (سورۃ المائدہ، آیت ۴۸)

مقاصدِ شریعت میں اتحاد کے باوجود کیفیتِ تعمیل میں یا ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اسباب کے اختیار کرنے میں جو اختلاف ہوتا ہے اس کو فروعی احکام میں اختلاف کہا جاتا ہے، چنانچہ نماز، روزہ، انفاق فی سبیل اللہ کے جو تفصیلی احکام ہیں، ان میں امم سابقہ اور امتِ محمدیہ کے درمیان فرق ہے، اور خود امتِ محمدیہ میں نصوص کی بنیاد پر جو فروعی احکام میں اختلافات ہیں ان کو رحمت فرمایا گیا ہے کہ اس سے توسّع پیدا ہوتا ہے اور اختلاف کرنے والے تمام اہلِ ایمان کا مقصود، رضائے الٰہی کا حصول اور نجاتِ آخرت ہی ہے۔

لیکن اگر اختلافات کی بنیاد دینوی مفادات ہوں تو قرآن کریم میں اس کی مذمت بیان کی گئی ہے:

وما تفرقوا الامن بعد ما جاء هم العلم بغيا بينهم. اور نہیں متفرق ہوئے مگر علم آجانے کے بعد محض آپس کی ضد کی بنیاد پر۔ (سورۃ الشوریٰ آیت ۱۴)

آیتِ پاک سے معلوم ہوا کہ علم حاصل ہونے کے بعد اختلاف نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بغیا بینھم کے سبب ہوتا ہے اور آیتِ پاک میں جس چیز کو بغیا بینھم کہا گیا ہے اس سے مراد تعصب، نفسانیت، عداوت، حبِ جاہ حبِ مال جیسی چیزیں ہیں جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں اور ان ناپسندیدہ امور کے پیش نظر حق کو تسلیم نہ کرنا اپنی مزعومہ رائے پر اصرار کرنا اور اختلاف پیدا کرنا ہرگز روا نہیں۔

جو لوگ حقیقتِ حال کے واضح ہونے کے باوجود فروعی اختلافات کو ہوا دے کر امت کو انتشار میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں انھیں ان باتوں سے سبق لینا چاہیے اور ائمہ متبوعین اور اہل حق کے بارے میں زبان درازی اور دشنام طرازی سے بچنا چاہیے۔ کیونکہ فروعی اختلاف کا حکم یہ ہے کہ ہر مسلمان اور ہر جماعت کو اپنے ائمہ کے مسلک مختار کو راجح قرار دے کر اس پر عمل کرنا چاہیے اور دوسرے فریق کے بارے میں ہرزہ سرائی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

قرأت خلف الامام بھی اختلافی مسائل میں سے ہے، اور اس مسئلے میں اختلاف راجح اور مرجوح یا افضل وغیر افضل کا نہیں بلکہ واجب اور مکروہ تحریمی کا ہے لیکن اس کے باوجود

کسی امام یا اس کے مقلدین نے دوسرے فریق کی نماز کو فاسد نہیں کہا، جبکہ اس زمانہ کا ایک نوزائیدہ فرقہ اس مسئلہ میں بھی حدود سے تجاوز کر رہا ہے۔

امام بخاریؒ قرأت خلف الامام کے قائل ہیں، انھوں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ ''جزء القرأۃ خلف الامام'' کے نام سے تصنیف فرمایا ہے اور صحیح بخاری میں بھی ایک باب منعقد فرمایا ہے مگر یہ ترجمۃ الباب صرف قرأت خلف الامام سے متعلق نہیں، بلکہ انھوں نے امام و منفرد کی قرأت کا مسئلہ بھی اسی کے ساتھ مربوط کر دیا، پھر اس کے ذیل میں جو تین روایات ذکر ہیں ان میں سے دو روایات کا مقتدی کی نماز سے کوئی تعلق نہیں، صرف ایک روایت اس مسئلہ سے متعلق ہے اور اس میں بھی مقتدی پر قرأت کے وجوب یا جواز کی تصریح نہیں، محض یہ ہے کہ اس کے عموم سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اور عموم سے فائدہ اٹھا کر کیا جانے والا استدلال نصوص فہمی کے اصول کے مطابق کمزور استدلال ہے، لیکن اس کمزوری کے باوجود امام بخاری کی جلالتِ شان کے پیش نظر بہت محتاط انداز اختیار کیا گیا ہے۔

فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمد صاحب قدس سرہٗ (سابق صدر المدرسین دار العلوم دیو بند و سابق صدر جمعیۃ علماء ہند) کے درسی افادات پر مشتمل اس رسالہ میں اس مسئلہ پر امام بخاری کے پیش کردہ دلائل کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ امام بخاریؒ جس روایت کے عموم سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ محل نظر ہے اور اس کے عموم میں مقتدی کو شامل سمجھنا قرآن، حدیث، تعامل صحابہ اور خود اس حدیث کے راویوں کے مسلک مختار کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام تحفظ سنت کانفرنس (منعقدہ ۲-۳ رمئی ۲۰۰۱ء) کے موقع پر دار العلوم دیو بند اس رسالہ کو شائع کر رہا ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم ہم تمام مسلمانوں کو قبولِ حق کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ان اختلافات سے ہماری حفاظت کرے جو خدا کے نزدیک بغیا بینھم کا مصداق ہیں۔

والحمد لله اوّلاً و آخراً

ریاست علی غفرلہٗ
استاذ دار العلوم دیوبند

باب وجوب القراء ة للامام والماموم فی الصلوات كلّهما فی الحضر والسفر ومایجهر فیها ومایخافت

امام اور مقتدی پر تمام نمازوں میں قرأت قرآن کے واجب ہونے کا بیان حضر کی نماز ہو یا سفر کی اور وہ نماز ہو جس میں جہر کیا جاتا ہے یا وہ نماز جس میں سراً پڑھا جاتا ہے

حدّثنا موسیٰ، قالَ: حدّثنا ابوعوانةَ قالَ حدثنا عبدالملکِ بن عُمیرٍ، عن جابر بن سَمُرَةَ قال: شَکیٰ اَھْلُ الکوفةِ سعْداً الیٰ عُمَر فعزلہ' واستعمل علیھم عمّاراً فشکوا حتی ذکروا اَنّہ' لایُحْسنُ یُصلی فارسلَ الیهِ فقالَ: یا أبا اسحاق اِنَّ ھٰؤلاء یزعُمُوْنَ اَنَّکَ لاتُحسِنُ تُصلّی قال: اَمّا أنا واللّٰهِ فانی کُنْتُ اُصلّیٰ بِھِمْ صلوٰة رسولِ اللّٰه ﷺ ما أخرِمُ عنها، اُصَلّیٰ صلوٰةَ العشاءِ فارْکِدُ فی الاوْلَیَیْنِ واُخِفُّ فی الاُخْرِیَیْنِ قال: ذٰلکَ الظَّنُّ بِکَ یا ابَا اسحاق فارْسَلَ معہ' رجُلاً او رِجالاً الی الکوفةِ یَسْأَلُ عنہُ اَھْلَ الکُوفَةِ ولَمْ یَدَعْ مسجداً الاّ سألَ عنه وَ یُثْنُوْنَ علیهِ مَعْروفاً حتّیٰ دخل مسجداً لبنی عبسٍ فقامَ رجُلٌ منھم یقالُ لَہ' اُسامةُ ابنُ قتادہ یُکْنٰی أبا سَعْدةَ فقال: اَمّا اِذْ نَشَدْتَنَا فاِنَّ سعْداً کانَ لایسیر بالسَّرِیَّةِ ولا یَقْسِمُ بِالسَّوِیَّةِ ولایَعْدِلُ فِیْ الْقَضِیَّةِ قالَ سَعْدٌ: اما وَاللّٰهِ لأدْعُوَنَّ بثلاثٍ اللّٰھُمَّ اِنْ کانَ عَبْدُکَ ھٰذا کاذِباً قامَ رِیاءً وسُمْعَةً فأطِلْ عُمْرة واطِلْ فَقْرَہ' وَ عَرِّضْہ' بِالْفِتَنِ وَکانَ بَعْدُ اِذَا سُئِلَ یقُوْلُ: شیخٌ کبیرٌ مَفْتُوْنٌ أصابَتْنِیْ دَعْوَةُ سَعْدٍ قالَ عبدُ المَلِکِ: فأنَا رأیْتُہُ بَعدُ قَدْ سَقَطَ حاجِباہُ عَلٰی عَیْنَیْهِ مِنَ الکِبرِ واِنّہ' لَیَتَعَرَّضُ لِلْجَوارِیْ فی الطُّرقِ یَغْمِزُھُنَّ.

حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ عبدِ اللّٰهِ قالَ: حَدَّثَنَا سُفیانُ، حَدَّثَنَا الزُّھرِیُّ عَنْ

مَحْمُوْدِ بْنِ الرَّبِیعِ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لاصَلٰوۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ.

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا یَحْیٰ عَنْ عُبَیْدِ اللّٰهِ قَالَ: حَدَّثَنِیْ سَعِیْدُ بْنُ أَبِیْ سعید عَنْ أبیہِ عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ ﷺ دَخَلَ المسجدَ فَدَخَلَ رَجُلٌ فَصَلّٰی فَسَلَّمَ عَلَی النبیِّ ﷺ وفردٌ وقال: اِرْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ فَرَجَعَ فَصَلّٰی کما صلّٰی ثم جاء فسلّمَ علی النبی ﷺ فقال اِرْجع فصلِّ فإنّکَ لم تصلِّ ثلاثاً وَقَالَ: وَالَّذِیْ بعثکَ بِالْحَقِّ ما اُحْسِنُ غَیْرَہٗ فَعَلِّمْنِیْ فقال: إذا قُمْتَ الَی الصَّلاۃِ فَکَبِّرْ ثُمَّ اقْرأ ماتَیَسَّرَ مَعَکَ مِنَ القرآنِ ثُمَّ ارْکَعْ حتّٰی تَطْمَئِنَّ راکعاً ثُمَّ ارْفَعْ حتی تَعْتَدِلَ قائماً ثُمَّ اسْجُدْ حتّٰی تَطْمَئِنَّ ساجداً ثُمَّ ارْفَعْ حتّٰی تَطْمَئِنَّ جَالِساً وَافْعَلْ فِیْ صَلوٰتِکَ کُلِّها.

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ اہل کوفہ نے حضرت عمرؓ سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے انھیں معزول کر دیا اور حضرت عمار بن یاسر کو ان کا حاکم مقرر کر دیا، اہل کوفہ نے شکایت میں یہاں تک کہا کہ حضرت سعد نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھاتے، حضرت عمرؓ نے حضرت سعد کو بلایا اور کہا کہ اے ابواسحاق! یہ اہل کوفہ یہ کہتے ہیں کہ آپ نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھاتے؟ حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ میں خدا کی قسم، ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی نماز پڑھاتا رہا، اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ (مثلاً) عشاء کی نماز اس طرح پڑھاتا تھا کہ پہلی دو رکعتوں میں دیر تک ٹھہرتا تھا اور آخر دونوں رکعتوں میں تخفیف کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے ابواسحاق! آپ کے بارے میں گمانِ غالب یہی ہے۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان کے ساتھ ایک آدمی کو یا کئی آدمیوں کو کوفہ روانہ کیا جو اہل کوفہ سے حضرت سعدؓ کے بارے میں سوالات کر کے تحقیق کریں، انھوں نے کوفہ کی ایک ایک مسجد میں جا کر حضرت سعدؓ کے بارے میں تحقیق کی، اور اہل کوفہ حضرت سعدؓ کے اچھے کاموں کی تعریف کرتے رہے، یہاں تک کہ جب بنوعبس کی مسجد میں گئے تو ایک شخص جن کو اسامہ بن قتادہ کہتے تھے اور جن کی کنیت ابوسعدہ تھی۔ کھڑا ہوا اور کہا کہ جب آپ قسم دے کر پوچھتے ہیں تو بات یہ ہے کہ سعد جہاد میں لشکر کے ساتھ نہیں جاتے، مال کی

تقسیم میں برابری نہیں کرتے اور فیصلہ میں انصاف نہیں کرتے۔ (یہ سن کر) حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ میں تو بخدا ضرور تین بددعائیں کروں گا کہ اے اللہ! اگر تیرا یہ بندہ جھوٹا ہے اور ریاکاری اور شہرت کے لیے کھڑا ہوا ہے تو اس کی عمر کو دراز فرمادے اور اس کے فقر کو طویل کردے اور اس کو فتنوں کا نشانہ بنادے۔ اور اس شخص سے جب بعد میں حال پوچھا جاتا وہ کہتا تھا کہ میں ایک عمر رسیدہ مبتلائے فتنہ بوڑھا ہوں مجھے سعد کی بددعا لگ گئی۔ عبدالملک نے کہا کہ میں نے اس کو بعد میں دیکھا، بڑھاپے کی وجہ سے اس کی دونوں پلکیں اس کی آنکھوں پر آگری تھیں اور راستے میں لڑکیوں کا پیچھا کرتا تھا یعنی اُن کو چھیڑتا تھا۔ حضرت عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اُس کی نماز نہیں ہوئی، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ایک شخص مسجد میں داخل ہوا پھر اس نے نماز پڑھی، پھر آکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ لوٹ کر جاؤ پھر نماز پڑھو اس لیے کہ تمھاری نماز نہیں ہوئی چنانچہ وہ شخص لوٹ کر گیا اور اس نے بعینہٖ اسی طرح نماز پڑھی جیسے پہلے پڑھی تھی پھر آیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا پھر آپ نے یہی فرمایا کہ لوٹ کر جاؤ پھر نماز پڑھو اس لیے تمھاری نماز نہیں ہوئی، یہ بات تین مرتبہ پیش آئی، تو اس شخص نے عرض کیا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا آپ مجھے سکھلادیں! تو آپ نے فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو، پھر جو قرآن کریم آسانی سے پڑھ سکتے ہو یعنی یاد ہے اس کی قرأت کرو پھر رکوع میں جاؤ۔ یہاں تک کہ رکوع کی حالت میں اطمینان ہوجائے پھر رکوع سے سر اٹھاؤ یہاں تک کے سیدھے کھڑے ہوجاؤ پھر سجدہ میں جاؤ یہاں تک کے سجدے کی حالت میں اطمینان ہوجائے پھر سجدے سے سر اُٹھاؤ یہاں تک کے بیٹھنے کی حالت میں اطمینان ہوجائے پھر اپنی پوری نماز میں اسی طرح عمل کرتے رہو۔

مقصد ترجمہ

فرماتے ہیں کہ تمام نمازوں میں قرأت ضروری ہے، ہر شخص کے لیے ضروری ہے

ہر حال میں ضروری ہے امام کے لیے بھی اور مقتدی کے لیے بھی، سری نمازوں میں بھی اور جہری نمازوں میں بھی، سفر کی حالت میں بھی اور حضر کی حالت میں بھی نماز کے لیے قرأت ضروری ہے گویا یہ ترجمۃ الباب ایک عام دعویٰ ہے، اور قرأت سے متعلق آنے والے ابواب اس کی تفصیل ہیں۔

بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بخاری مطلق قرأت کو ضروری کہہ رہے ہیں اور فاتحہ وغیر فاتحہ سے اس ترجمہ میں بحث نہیں کر رہے ہیں، گویا ہماری موافقت کر رہے ہیں جبکہ وہ اس مسئلے میں ہمارے ساتھ نہیں ہیں وہ تو قرأت خلف الامام کے علم بردار ہیں، اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ جزء القراءۃ خلف الامام کے نام سے تحریر فرمایا ہے اور اس میں امکان کی حد تک زور صرف کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب ہے تو یہی ہے اور اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ یا تو ثابت نہیں یا بہت کمزور ہے۔ لیکن جب یہ مسئلہ صحیح بخاری میں آیا تو بڑی احتیاط سے کام لیا، امام بخاری کو اپنے مسلک کے مطابق کہنا چاہیے تھا۔ وجوب الفاتحۃ للامام والماموم الخ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری بھی مسئلہ کی نزاکت کو سمجھ رہے ہیں کہ صاف کہنے کا موقع نہیں ہے، اس لیے ابہام سے کام لینا چاہیے ورنہ اُن کے پیش نظر یہاں دو مسئلہ ہیں ایک قرأت خلف الامام کا مسئلہ اور دوسرے رکنیت فاتحہ کا، پہلے مسئلہ کے بارے میں تو انھوں نے فرمادیا القراءۃ للامام والماموم مقتدی کو امام کے ساتھ لے لیا کہ قرأت امام کے لیے بھی ضروری ہے اور مقتدی کے لیے بھی جبکہ یہ بات یہاں بھی واضح نہ ہوسکی کہ دونوں پر ایک ہی طرح کی قرأت ہے، فاتحہ بھی اور ضم سورت بھی یا ان دونوں میں کچھ فرق ہے کہ مقتدی پر صرف فاتحہ واجب ہو ضم سورت ضروری نہ ہو، اور دوسرے مسئلہ یعنی رکنیت فاتحہ کے سلسلے میں وہ بالکل خاموش گذر گئے، حالانکہ روایاتِ باب میں وہ روایت بھی مذکور ہے جسے رکنیت فاتحہ کے سلسلے میں بڑے شدو مد سے پیش کیا جاتا ہے اور خود امام بخاری نے بھی جزء القرأۃ میں اس مسئلہ پر استدلال کرتے ہوئے پیش فرمایا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ امام بخاری یہاں جس چیز کی پردہ داری فرما رہے ہیں اس میں انصاف کے ساتھ غور کرنے والوں کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ اصل مسئلہ کی وضاحت سے بچتے ہوئے امام بخاری نے ترجمۃ الباب کے الفاظ میں جو بات

کہی ہے وہ کئی اجزاء سے مرکب ہے اور ان کا قدر مشترک یہ ہے کہ ہر طرح کی نماز میں ہر حال میں قرأت ضروری ہے اور اس کے لیے امام بخاری نے دلیل بھی مرکب پیش کی ہے، ہر ہر روایت میں تمام اجزاء نہیں ہیں بلکہ مجموعۂ روایات سے دعویٰ ثابت ہوگا۔

ہم اصل موضوع پر بعد میں کچھ گفتگو کریں گے، پہلے بخاری کی ذکر فرمودہ روایات کی تشریح اور ان سے بخاری کے مقصد کو ثابت کرنے کا طریقہ معلوم کرلیا جائے۔

تشریح حدیث اوّل

حضرت جابر بن سمرہؓ جو حضرت سعد بنؓ ابی وقاص کے بھانجے ہیں بیان کرتے ہیں کہ کوفہ کے کچھ لوگوں نے حضرت عمرؓ تک، حضرت سعد بنؓ ابی وقاص کی شکایتیں پہنچائیں اور حد ہوگئی یہاں تک کہہ دیا کہ صحیح طور پر نماز پڑھانا بھی نہیں جانتے۔

حضرت سعدؓ، عشرۂ مبشرہ میں ہیں اللہ کے راستے میں تیر اندازی کرنے والے پہلے مسلمان ہیں بدر اور دیگر غزوات میں شریک رہے ہیں، ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ دستہ میں شامل رہا کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر انھیں اَللّٰھُمَّ سدد سھمه واجب دعوته کی دعا دی تھی، اس لیے مستجاب الدعوات ہیں، حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب کوفہ کو منصوبے کے ساتھ آباد کیا گیا تو سعدؓ بن ابی وقاص کو اس کا امیر مقرر کیا گیا اور کئی سال تک مسلسل وہاں کے امیر رہے اور کوفہ کی آبادی، نیز اس کی تعمیر و ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت سعدؓ کوفہ کی عظمت کو دو بالا کر رہے ہیں اور چند لوگ اسی زمانے میں متعدد شکایتیں پہنچانے پر لگے ہوئے ہیں، بعض کا روایت میں تذکرہ آرہا ہے۔

فعزله عمر الخ شکایات پہنچیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت سعد کو معزول کردیا، معلوم ہوا کہ اگر مصلحت کا تقاضہ ہو تو تحقیق حال، یا الزام ثابت ہونے سے پہلے معزول کرنا بھی جائز ہے، مصلحت یہ ہوسکتی ہے کہ اگر یہ وہاں حاکم رہیں گے تو شکایات بڑھ سکتی ہیں، فتنہ پیدا ہوسکتا ہے وغیرہ، نیز یہ کہ شکایات کی تحقیق کا معتبر طریقہ بھی یہی ہے کہ حاکم کو تبدیل کردیا جائے تاکہ بیان دینے والے بے خوف ہوکر زبان کھول سکیں، یہاں ایسا ہی ہوا کہ

حضرت عمرؓ نے، حضرت سعدؓ کو الگ کر دیا، پہلے تو حضرت سعدؓ کو بلایا اور ان سے معلوم کیا کہ آپ کے بارے میں یہ شکایت آئی ہے کہ آپ نماز ٹھیک طریقے پر نہیں پڑھاتے۔

حضرت سعدؓ نے اس کے جواب میں جو بیان دیا۔ اور اسی سے امام بخاری کا ترجمۃ الباب بھی متعلق ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ میں نماز کے اندر پورے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرتا ہوں، اس میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں کرتا، مثال کے طور پر بتاتا ہوں کہ عشاء کی نماز چار رکعت ہے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق پہلی دو رکعتوں میں دیر تک ٹھہرتا ہوں اور آخر کی دو رکعتوں کو ہلکا رکھتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ ضم سورت بھی ہے اور آخری دو رکعتوں میں ضم سورت نہیں ہے۔

اس سے ترجمۃ الباب کا ایک جز، یعنی قرأت علی الامام ثابت ہو گیا، مقتدی پر قرأت کے وجوب یا جواز کے لیے روایت میں کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ اور ثابت ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر رکعت میں قرأت فرماتے تھے اور یہ کہ بعض نمازوں میں جہر تھا اور بعض میں سر تھا لیکن یہ کہ ایسا کرنا واجب یا سنت ہے تو اس کے لیے بھی روایت میں کوئی صراحت نہیں ہے ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ آپ کا یہ عمل مواظبت کے ساتھ تھا اس لیے اس سے وجوب کی طرف اشارہ ہو گیا۔

ذاک الظنّ بک حضرت عمرؓ نے فرمایا، آپ کے بارے میں ہمارا گمان بھی یہی ہے، یعنی ہمیں اطمینان ہے، حضرت عمرؓ نے بعد میں ایک موقع پر اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا ہے **فانی لم اعزلہ من عجز و لا خیانۃ** کہ میں نے حضرت سعدؓ کو کسی کوتاہی میں یا خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا آپس کی اور نجی معاملات کی بات تو یہ ہوئی لیکن شکایات کے ازالہ کے لیے باقاعدہ تحقیق بھی ضروری ہے۔

فارسل معہ الخ چنانچہ تحقیق احوال کے لیے چند آدمیوں کو حضرت سعدؓ کے ساتھ کوفہ روانہ فرمایا، ان لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کوفہ کی تمام مسجدوں میں پہنچے کہ وہاں تمام مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے اور حضرت سعدؓ کی تمام شکایات کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ لوگوں نے ان کو کیسا پایا؟ ہر ہر جگہ حضرت سعدؓ کی تعریف ہی سنی کہ آپ بڑے اچھے

ہیں اور وہ تمام باتیں جنھیں شریعت میں "معروف" کہا جاتا ہے ان میں پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ جب بنو عبس کی مسجد میں پہنچے تو ایک شخص نے جس کی کنیت ابوسعدہ اور نام اسامہ بن قتادہ تھا۔ یہ بیان دیا۔

اما اذا نشدتنا الخ مراد یہ ہے کہ دوسرے لوگوں نے جو تعریف کی باتیں کہی ہیں اس کے تو وہ ذمہ دار ہیں مگر آپ قسم دے کر پوچھ رہے ہیں تو کہنا پڑتا ہے کہ حضرت سعدؓ کے بارے میں پہلی بات یہ ہے کہ وہ جہاد کے لشکروں میں دوسروں کو روانہ کر دیتے ہیں اور خود شریک نہیں ہوتے، یہ کیا بات ہوئی؟ بزدلی کا الزام اور شجاعت کی نفی ہوئی، اور دوسری بات یہ کہ مال کی تقسیم انصاف کے ساتھ نہیں کرتے، جنبہ داری کرتے ہیں، یہ دیانت پر اعتراض ہوا کہ اپنوں کو دیتے ہیں یا خود زائد رکھ لیتے ہیں اور تیسری بات یہ کہ فیصلہ انصاف کے ساتھ نہیں کرتے اور رعایت سے کام لیتے ہیں، یہ عدالت پر حملہ ہوا، خلاصہ یہ ہوا کہ اس شخص نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر تین طرح کے الزامات عائد کیے ایک کا تعلق شجاعت کی نفی سے تھا جو قوتِ غضب کے کمال و اعتدال کا نام ہے، دوسرے کا تعلق دیانت وعفت کی نفی سے تھا جو قوتِ شہوانیہ کے کمال و اعتدال کا نام ہے اور تیسرے کا تعلق حکمت وعدل کی نفی سے تھا جو قوتِ عاقلہ کے کمال و اعتدال کا نام ہے، گویا اس شخص نے حضرت سعد کے تینوں اخلاقی فضائل و کمالات کا سرے سے انکار کر دیا۔ جب کہ وہ ان تمام عیوب سے بَری تھے اور تمام ان کمالات کے حامل تھے جن کی مذکورہ شخص نے نفی کی، یہ سن کر حضرت سعدؓ کو غصہ آ گیا اور آنا بھی چاہیے تھا کہ وہ اتنی بے سروپا باتیں کہہ گیا، بعض روایات میں ہے فغضب سعد، اور بعض میں ہے اعلی تشجع؟ افسوس ہے کہ تم میرے بارے میں اتنی دیدہ دلیری کر رہے ہو؟

اما واللہ لادعون الخ حضرت سعدؓ کو غصہ آیا اور انھوں نے الزام عائد کرنے والے کو تین بددعائیں دیں، لیکن کتنی حیرت اور کتنے انصاف کی بات ہے کہ غصہ کی حالت میں پوری احتیاط ملحوظ ہے، بددعا کو دو باتوں پر معلّق کر رہے ہیں کہ پروردگار اگر یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے اور اگر اس کے پیش نظر دنیوی اغراض ہیں تو میں اس کے عائد کردہ تین الزامات کے بقدر تیری بارگاہ میں تین باتیں عرض کرتا ہوں، یہ کہتا ہے کہ میں لشکر میں نہیں

جاتا، مجھے جان پیاری ہے اور میں طویل زندگی کا خواہش مند ہوں، میں اس کے بارے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اس کی عمر کو دراز کردے، یعنی اس کو قویٰ کی کمزوری کے ساتھ ارذل العمر تک پہنچادے، یہ شخص الزام عائد کرتا ہے کہ میں مال کی تقسیم میں برابری نہیں کرتا اور گویا میں مال کا طلب گار ہوں الٰہی اگر یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے تو اس کے فقر کو طویل کردے، یہ شخص مجھ پر یہ عیب لگاتا ہے کہ میں انصاف سے کام نہیں لیتا جنبہ داری کرتا ہوں گویا میں مسلمانوں کے نزاعی معاملات میں تصفیہ کرنے کے بجائے فتنے پیدا کرتا ہوں الٰہی اگر یہ جھوٹ بول رہا ہے تو اس کو فتنوں میں مبتلا کردے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص مستجاب الدعوات تھے، تینوں بددعائیں قبول ہوگئیں، اس شخص کی عمر بھی طویل ہوئی، فقر اور فتنہ میں بھی مبتلا ہوا، نابینا بھی ہوگیا تھا اور مانگتا پھرتا تھا۔ اس سے کوئی پوچھتا کہ کیا حال ہے؟ تو کہتا تھا کہ حضرت سعدؓ کی بددعا کھا گئی؟ بوڑھا ہوں، عمر رسیدہ ہوں، مبتلائے فتنہ ہوں وغیرہ۔ عبدالملک کہتے ہیں کہ میں نے اس شخص (ابوسعدہ) کو اس حال میں دیکھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی آنکھ کی ابرو نیچے لٹک گئی تھی اور راستے میں چلتے ہوئے عورتوں کو چھیڑتا تھا۔

پہلی روایت ختم ہوگئی، اس سے صرف یہ معلوم ہوا کہ امام قرأت کرے گا۔ مقتدی یا منفرد کا اس میں کوئی ذکر نہیں، البتہ روایت سے متعدد فوائد مستنبط ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ ظالم کے لیے بددعا کرنا جائز ہے، اور یہ کہ اہل اللہ سے دل میں کدورت رکھنا تباہی کا سبب ہوتا ہے، اور شاید حضرت سعدؓ نے بددعا دے کر اس ظالم کو آخرت کے عذاب سے بچایا ہے کہ اس کے ان بُرے اعمال کی دنیا ہی میں سزا مل جائے اور وہ آخرت کی گرفت سے بچ جائے۔ واللہ اعلم

تشریح حدیث دوم

دوسری روایت حضرت عبادہؓ بن صامت کی ہے جسے رکنیت فاتحہ اور قرأت خلف الامام کے ثبوت کے لیے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، روایت میں ہے کہ جس نے فاتحۃ الکتاب کو نہیں پڑھا تو اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔

مقصد ترجمہ کی وضاحت میں بیان کیا گیا تھا کہ امام بخاریؒ کے پیش نظر دو مسئلے ہیں، ایک

رکنیت فاتحہ اور دوسرے قرأت خلف الامام، اس روایت سے پہلے مسئلہ پر استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں لاصلوٰۃ الخ فرمایا گیا ہے، لائے نفی جنس حقیقت کے انتفاء کا تقاضہ کرتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر حقیقت صلوٰۃ ہی محقق نہ ہوگی اور رکنیت کے یہی معنی ہیں۔

دوسرے مسئلہ پر استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ روایت میں دو جگہ عموم ہے ایک لاصلوٰۃ میں، کہ نکرہ، نفی کے تحت عموم کا فائدہ دیتا ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ نماز امام اور منفرد کی ہو یا مقتدی کی، نیز جہری ہو کہ سرّی، سفر کی ہو یا حضر کی قرأت فاتحہ کے بغیر اس کا وجود ہی نہیں، اور دوسرا عموم لمن لم یقرء کے کلمہ من میں کہ نمازی کوئی بھی ہو، امام ہو یا مقتدی، فاتحہ کی قرأت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

دوسرے مسئلہ پر تو گفتگو تینوں روایات کی تشریح کے بعد کی جائے گی، البتہ پہلے مسئلہ یعنی رکنیت فاتحہ کے سلسلے میں یہیں یہ بات عرض کر دی جائے کہ امام شافعی رکنیت کے قائل ہیں، امام مالکؒ کی ایک روایت بھی اسی کے مطابق ہے، دوسری روایت میں وہ فاتحہ اور ضم سورت دونوں کی رکنیت کے قائل ہیں، امام احمدؒ مشہور قول میں شوافع کے ساتھ ہیں اور دوسرا قول حنفیہ کے مطابق ہے۔

رکنیت فاتحہ کے سلسلے میں ائمہ ثلٰثہ کی دلیل یہی حضرت عبادہؓ کی روایت ہے جس میں لاصلوۃ لمن الخ فرمایا گیا ہے، استدلال کا طریقہ ذکر کیا جا چکا ہے، حنفیہ کی دلیل قرآن کریم کی آیت فاقرءوا ما تیسّر من القرآن ہے جس سے مطلق قرآت کی رکنیت ثابت ہوتی ہے، نیز مسیئ فی الصلوۃ کی صحیح روایت جو اسی باب میں مذکور ہے، جس میں ثم اقرأ ما تیسّر معک من القرآن فرمایا گیا ہے اس سے بھی مطلق قرأت کی رکنیت کا ثبوت ہو رہا ہے، گویا قرآن کریم کی آیت جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہے۔ مطلق قرأت کو فرض قرار دے رہی ہے اور حضرات شوافع حضرت عبادہؓ کی روایت لاصلوۃ الخ سے جو خبر واحد ہے اور ظنی الثبوت وظنی الدلالۃ ہے۔ قرآن کریم کے عموم کی تخصیص کر رہے ہیں اور ایسا کرنا حضرات حنفیہ کے مقرر کردہ اصول کے خلاف ہے۔

بعض حضرات کی طرف سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حدیث لاصلوٰۃ الخ خبر واحد نہیں خبر مشہور ہے جیسا کہ امام بخاری نے جزء القرأۃ میں ارشاد فرمایا ہے اور خبر مشہور سے کتاب

اللہ کی تخصیص جائز ہے، لیکن علامہ عینی نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس روایت کو خبر مشہور قرار دینا جائز نہیں ہے خبر مشہور وہ ہے جسے عہد تابعین میں تلقی بالقبول کا درجہ حاصل ہو گیا ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ عہد تابعین میں اختلافی رہا ہے، اور اگر بالفرض اس کو خبر مشہور تسلیم کر بھی لیا جائے تو دوسری بات یہ ہے کہ کتاب اللہ کی تخصیص کے لیے خبر مشہور کا محکم ہونا ضروری ہے۔ محتمل سے کام نہیں چلتا اور یہاں یہ قوی احتمال موجود ہے کہ لاصلوٰۃ میں نفی کو حقیقت کے بجائے، کمال کی نفی پر محمول کیا جائے۔

(یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ حضرت عبادہ کی روایت میں لاصلوٰۃ کو نفی کمال پر محمول کرنے کی بات حنفیہ کے یہاں صرف اس صورت میں ہے جب تمام قرائن سے صرف نظر کر کے صرف انہی الفاظ کے ظاہر پر انحصار کیا جائے جو بخاری کی روایت میں ہیں اور مراد یہ ہو کہ فاتحہ نہ پڑھنے کی صورت میں نماز کی نفی کی جارہی ہے لیکن اگر دیگر قرائن کا لحاظ کر کے معنی کا تعین کیا جائے اور مراد یہ متعین کی جائے کہ فاتحہ اور سورت دونوں کے نہ پڑھنے کی صورت میں نماز کی نفی کی جارہی ہے تو اس صورت میں لاصلوٰۃ سے نفی ذات کو مراد لیا جائے گا۔)

اس احتمال کے قوی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی صحیح روایت نے نفی کمال کے معنی ہی کو راجح کر دیا ہے، جس میں ارشاد فرمایا گیا **من صلی صلوۃ لم یقرء فیھا بام القرآن فھی خداج ثلثا غیر تمام** (مسلم جلد ا، ص ۱۶۹) جس نے نماز میں سورہ فاتحہ کو نہیں پڑھا اس کی نماز ناقص و ناتمام ہے۔

اس لیے حنفیہ نے تو قرآن و حدیث دونوں پر عمل کرتے ہوئے مطلق قرأت کو رکن اور فرض، اور سورہ فاتحہ کی قرأت کو واجب قرار دیا ہے کہ مطلق قرأت نہ کرے تو سرے سے نماز ہی نہیں ہوئی اور اگر قرأت کرے لیکن سورۂ فاتحہ کو نہ پڑھے تو نماز ناتمام ہوئی، اور ترک واجب کی بنیاد پر نماز واجب الاعادہ قرار پائی، گویا پڑھی بے پڑھی برابر ہوگئی، اس لیے بعض حضرات نے اس کو تقریباً نزاع لفظی قرار دیا، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ حنفیہ کی نظر دقیق ہے اور وہ تمام دلائل کو اپنی اپنی جگہ رکھنے میں زیادہ کامیاب ہیں۔

تشریح حدیث سوم

تیسری روایت حضرت ابو ہریرہؓ کی ہے جو مسئی فی الصلوۃ کی روایت کے نام سے

مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے اور بعض روایات میں ہے کہ آپ مسجد کے ایک گوشہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک صاحب جن کا نام خلاد بن رافع انصاری تھا، مسجد میں آئے، پہلے انھوں نے دو رکعت نماز ادا کی، ہوسکتا ہے کہ یہ نماز تحیۃ المسجد کی ہو یا اور کوئی نفل نماز ہو اور ممکن ہے کہ مسجد میں نماز ہو چکی ہو اور انھوں نے اپنی نماز ادا کی ہو، بہر حال انھوں نے انفرادی نماز پڑھی بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھتے رہے یرمقه' کے الفاظ ہیں، نماز کے بعد وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرکے جانا چاہتے تھے کہ آپ نے سلام کے جواب کے ساتھ یہ فرمادیا کہ ارجع فصل الخ تمھاری نماز نہیں ہوئی دوبارہ نماز پڑھو، انھوں نے دوبارہ اسی طرح نماز پڑھی، آپ نے پھر لوٹادیا، اسی طرح جب تین مرتبہ لوٹادیا تو انھوں نے کہا والذی بعثک الخ یعنی میں قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ میں اپنی دانست میں نماز کو اچھی طرح پڑھ رہا ہوں، میں اس سے بہتر نہیں جانتا، آپ تعلیم فرمائیں کہ کیا کوتاہی ہورہی ہے؟ اس تفصیل سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جو کوتاہی ہورہی تھی وہ ایسی نہیں تھی جس سے نماز باطل ہوجائے، کیونکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک شخص پیغمبر علیہ السلام کے لوٹانے پر بار بار باطل عمل کرتا رہے اور آپ خاموشی اختیار کیے رہیں، اس کے عمل میں کچھ تو قابلِ قبول ہونے کی شان ہونی چاہیے، مثلاً یہ کہ وہ اصل ارکان و فرائض تو ادا کررہا تھا اور واجبات میں کوتاہی ہورہی تھی، بہر حال اس نے درخواست کی تو آپ نے فرمایا اذا قمت الی الصلوۃ الخ کہ جب تم نماز کا ارادہ کرو تو تکبیر تحریمہ کہو ثم اقرأ ماتیسر الخ پھر قرآنِ کریم کا جو حصّہ تمھارے لیے آسان ہو یعنی جو بھی یاد ہو، حدیث میں بعینہٖ وہی حکم دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں ہے یعنی ثم اقرأ ام القرآن الخ یا الفاتحة وغیرہ نہیں فرمایا گیا بلکہ مطلق قرأت کا حکم دیا گیا ہے اب اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ماتیسر سے مراد سورہ فاتحہ ہی ہے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ تشریح تو آپ خود کررہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ماتیسر ہی فرمایا ہے۔

اس کے بعد آپ نے رکوع و سجود اور ان میں تعدیل ارکان کی اہمیت کو بیان فرمایا کہ اسی کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے نماز کا اعادہ کرایا جارہا تھا پھر آپ نے فرمایا وافعل فی صلوتک کلھا کہ اپنی پوری نماز میں مذکورہ ہدایات کی پیروی کرتے رہو۔ صلوتک سے

یہاں بہ ظاہر وہی نماز مراد ہوگی جو مخاطب کی طرف منسوب ہے، اور ظاہر ہے کہ وہ نماز انفرادی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ منفرد کے لیے نماز میں قرأت ضروری ہے۔

امام بخاریؒ کے استدلال کا خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ امام بخاری کا ترجمۃ الباب نماز میں قرأت کے وجوب سے متعلق کئی اجزاء پر مشتمل تھا اور ان اجزاء کو ثابت کرنے کے لیے امام بخاری نے جو تین روایات پیش کی ہیں ان میں پہلی روایت کا تعلق صرف امام سے ہے اور تیسری کا صرف منفرد سے، البتہ حضرت عبادہؓ بن صامت کی دوسری روایت میں گو کہ امام، منفرد اور مقتدی میں سے کسی کی صراحت نہیں، لیکن اس کی تعبیر کے عموم میں بہ ظاہر مقتدی کو بھی داخل مانا جاسکتا ہے، اس لیے قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر جو بخاری کے ترجمۃ الباب کے کئی اجزء میں سب سے اہم جز ہے صرف دوسری روایت سے استدلال ممکن ہے اس لیے اس روایت سے قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر کیئے گئے استدلال کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مقتدی اس کے عموم میں داخل ہے یا نہیں؟ لیکن اس مسئلہ کو شروع کرنے سے پہلے فقہاء کے مذاہب کا بیان کردینا مناسب ہے۔

بیان مذاہب ائمہ

حنفیہ کا مذہب ہے کہ نماز جہری ہو یا سری، امام کے پیچھے مقتدی کا قرأت کرنا جائز نہیں، البتہ بعض کتابوں میں امام محمدؒ کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو احتیاط کے طور پر مستحسن کہتے ہیں لیکن امام محمد کی موطا اور کتاب الآثار میں اس کے خلاف ہے اس لیے ابن ہمام نے لکھا ہے **الاصح ان قول محمد کقولھما** امام مالک اور احمد کے نزدیک جہری نمازوں میں مقتدی کو قرأت کی اجازت نہیں اور مغنی ابنِ قدامہ میں **ھذا احد قولی الشافعی** کہ امام شافعی کے دو اقوال میں سے ایک قول مالکیہ اور حنابلہ کے موافق ہے، نیز مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں سری نمازوں میں گو مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے مگر پڑھنا واجب کسی کے نزدیک نہیں ہے بلکہ مالکیہ کی کتابوں میں اس طرح

کی صراحت ہے فان ترک القراءۃ فلا شئی علیہ لان الامام یحملھا کہ اگر سری نماز میں مقتدی نے قرأۃ نہیں کی تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ امام اس ذمہ داری کو پورا کررہا ہے، البتہ امام احمد کے یہاں جہری نمازوں میں بھی اگر مقتدی دوری کی وجہ سے امام کی قرأت کو سن نہ پارہا ہو تو قرأت کی اجازت ہے، واجب یہاں بھی نہیں ہے، گویا یہ تینوں امام مقتدی کے باب میں ایک ہی انداز اختیار کئے ہوئے ہیں۔

البتہ امام شافعیؒ کی طرف مشہور قول کے مطابق یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ نماز جہری ہو یا سری مقتدی پر قرأت واجب ہے "مختصر مزنی" اور "مہذب" میں وجوب ہی کی بات نقل کی گئی ہے امام بیہقی وغیرہ نے اسی کو امام شافعی کا قول جدید قرار دیا ہے، لیکن امام شافعی کی کتاب الام سے اس کی تائید نہیں ہوتی، کتاب الام کے کتب قدیمہ یا جدیدہ میں ہونے کے سلسلے میں شوافع میں دونوں طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ امام الحرمین نے اس کو امام شافعیؒ کی کتب قدیمہ میں شمار کیا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ کتاب الام، امام شافعی کے مصر منتقل ہونے کے بعد کی تصنیف ہے، اور مصر جانے کے بعد کی کتابیں کتب جدیدہ کہلاتی ہیں، اسی لیے جلال الدین سیوطی نے اس کو کتب جدیدہ میں شمار کیا ہے۔

کتاب الام میں ایک جگہ امام شافعیؒ نے امام اور منفرد کے بارے میں یہ حکم بیان فرمایا کہ ان پر ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، پھر اس کے بعد فرمایا وساذکر المأموم ان شاء اللہ تعالیٰ کہ مقتدی کا حکم بعد میں بیان کیا جائے گا (کتاب الام جلد ۱، ص ۹۳) پھر اختلاف علی وعبداللہ بن مسعود کے تفصیلی ابواب میں کتاب الام (جلد ۷، ص ۱۵۳) میں مقتدی کے بارے میں یہ تحریر فرمایا کل صلوۃ صلیت خلف الامام والامام یقرء قرأۃ لا یسمع فیھا قرء فیھا، ہر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے اور امام ایسی قرأت کررہا ہو جو سنی نہ جاتی ہو تو مقتدی اس نماز میں قرأۃ کرے گا (کتاب الام جلد ۷، ص ۱۵۳) اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ امام جہری نماز میں ہو اور مقتدی قرأت سن رہا ہو تو اس کو قرأت نہیں کرنی چاہیے، لیکن کتاب الام کی ان تصریحات کے باوجود شوافع کا مسلک مختار یہی ہے کہ مقتدی پر بھی تمام رکعات میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، شرح مہذب میں ہے ان مذھبنا وجوب قراءۃ الفاتحۃ علی المأموم فی کل الرکعات من

الصلوة السرية و الجهرية، هذا هو الصحيح عندنا بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ وفات سے دو سال پہلے تک امام شافعی جہری نمازوں میں قرأت کی اجازت نہ دیتے تھے، بعد میں قرأت خلف الامام کے قائل ہو گئے گویا امام شافعی کی رائے بدل گئی، لیکن امام شافعی کے تلامذہ میں اتفاق رائے نہیں ہے اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے زمانے میں وجوب کی بات محقق نہ ہو اور نیچے آ کر تشدد اختیار کر لیا گیا ہو، دیکھئے امام احمد سے منقول ہے۔ **ما سمعنا احدا من اهل الاسلام يقول: ان الامام اذا جهر بالقراء ة لاتجزى صلوة من خلفه اذا لم يقرء** (المغنی جلد ۲، ص ۲۶۲) ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو بھی اس بات کا قائل نہیں پایا کہ جہری نماز میں مقتدی قرأۃ نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ امام احمدؒ کی اس بات سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی نظر میں امام شافعی کا قول وجوب کا نہیں ہے ورنہ وہ اتنا عام دعویٰ نہ کرتے۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ امام شافعیؒ اور ان کے تلامذہ کے دور میں شاید یہ محقق نہیں تھا کہ جہری نماز میں قرأۃ خلف الامام کو واجب قرار دیا جائے یا مستحب، مگر بعد میں وجوب کے قول کو ترجیح دے دی گئی۔

علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی فتاویٰ میں امام احمد کی طرف سے جہری نماز میں قرأت کے عدم وجوب پر اجماع نقل کیا ہے، ذمہ داری اُن پر ہے الفاظ یہ ہیں **و ذكر (الامام احمد) الاجماع على انه لاتجب القرأة على الماموم حال الجهر** (فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۲۳، ص ۲۶۹) نیز دوسری جگہ اپنے طور پر **مازاد على الفاتحة** کے سلسلے میں عدم وجوب پر اجماع، اور فاتحہ کے سلسلے میں عدم وجوب کو جمہور سلف کا قول قرار دیا ہے۔ اور امام کے جہر کرنے کی حالت میں قرأت کو منکر اور کتاب وسنت کے خلاف کہا ہے، کہتے ہیں **والامر باستماع قرأة الامام والانصات له مذكور فى القرآن وفى السنة الصحيحة وهو اجماع الامة فيما زاد على الفاتحة وهو قول جماهير السلف من الصحابة وغيرهم فى الفاتحة وغيرها وهو احد قولى الشافعى و اختارد طائفة من حذاق اصحابه كالرازى وابى محمد بن عبدالسلام فان القرأة مع جهر الامام منكر مخالف للكتاب والسنة.**

(فتاویٰ جلد ۲۲، ص ۳۴۲)

مذاہب کا خلاصہ انصاف کی رو سے یہ ہوا کہ حضرات ائمہ اقتداء کے مسئلہ کو الگ اور امامت وانفراد کے مسئلہ کو الگ دیکھ رہے ہیں، گویا شریعت کی نظر میں یہ دو مستقل باب ہیں جنھیں الگ الگ قائم کیا گیا ہے، کیونکہ امام اعظم، امام مالک اور امام احمد کے یہاں تو جہری نماز میں مقتدی پر قرأت نہیں ہے اور امام شافعی نے بھی کتاب الام میں یہی فرمایا ہے کہ وہ اقتداء کے مسئلہ کو الگ بیان کریں گے، پھر یہ کہ مندرجہ بالا معروضات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ امام شافعیؒ اور ان کے تلامذہ کے عہد میں قرأت خلف الامام کے وجوب کی بات محقق نہیں تھی۔

اس سلسلے میں ائمہ متبوعین کے مذاہب کی تفصیل تو وہ ہے جو عرض کی گئی، لیکن یہاں پر امام ترمذیؒ نے کمال کر دیا کہ قرأت خلف الامام کے سلسلے میں امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کو ایک طرف دکھلایا اور اہلِ کوفہ کو دوسری طرف، گویا تکثیر سواد مطلوب ہے، حالانکہ اس کا موقع نہیں تھا کیونکہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ جہری نماز میں تو ترکِ قرأت کے قائل ہیں اور سری میں بھی قرأت کو واجب نہیں کہتے۔ واللہ اعلم

صحابہ تابعینؒ اور دیگر اہلِ علم کا مسلک

یہ تو تھا ائمہ متبوعینؒ کے مذہب کا بیان، ان کے علاوہ صحابہ تابعین اور دیگر اہلِ علم اور فقہاء اسلاف کا کیا مسلک ہے تو اس سلسلے میں امام احمدؒ کا قول نقل کیا جا چکا ہے جس کا حاصل یہ تھا کہ امام احمد کے علم میں مقتدی پر وجوب قرأت کا اہلِ اسلام میں کوئی بھی قائل نہیں، اور اس قول کے بعد یہ تفصیل بھی مذکور ہے:

قال (احمد) هذا النبی صلی الله علیه وسلم واصحابه والتابعون وهذا مالک فی اهل الحجاز وهذا الثوری فی اهل العراق وهذا الاوزاعی فی اهل الشام وهذا اللیث فی اهل مصر ماقالوا لرجل صلی خلف الامام وقرأ امامه ولم یقرأ هو، صلوته باطلة۔ (المغنی جلد۲، ص۲۶۲)

امام احمد نے فرمایا کہ یہ ہیں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم، اور یہ ہیں آپ کے صحابہ اور صحابہ کے تابعین اور یہ ہیں اہلِ حجاز میں امام مالک، اور یہ ہیں اہل عراق میں سفیان ثوری،

اور یہ ہیں اہل شام میں امام اوزاعی، اور یہ ہیں اہلِ مصر میں امام لیث، ان میں سے کوئی بھی مقتدی کے بارے میں۔ جب امام قرأت کرے اور مقتدی قرأت نہ کرے۔ یہ نہیں کہتا کہ اس کی نماز باطل ہے۔

امام احمد کا یہ ارشاد صاف بتلا رہا ہے کہ انھوں نے جو ایک عام دعویٰ کیا تھا کہ اہلِ اسلام میں کوئی بھی مقتدی پر وجوبِ قرأت کا قائل نہیں، وہ کوئی سرسری بات نہیں ہے بلکہ انھوں نے یہ بات رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، صحابہ وتابعین کے اقوال وتعامل اور مشہور بلادِ اسلامیہ کے فقہاء کرام کے مسلک مختار کی تحقیق کے بعد ارشاد فرمائی ہے۔

پھر صاحبِ مغنی موفق الدین ابن قدامہ کے شاگرد اور بھتیجے شمس الدین بن قدامہ نے شرحِ مقنع میں بعض صحابہ، تابعین اور فقہاء کے نام بھی اس طرح ذکر کیے ہیں، فرماتے ہیں۔

ولا تجب القرأة على المأموم هذا قول اكثر اهل العلم و ممن كان لايرى القراءة خلف الامام على و ابن عباس و ابن مسعود و ابوسعيد و زيد بن ثابت وعقبة بن عامر و جابر و ابن عمر و حذيفة بن اليمان وبه يقول الثورى و ابن عينية واصحاب الرائ ومالك والزهرى والاسود وابراهيم وسعيد بن جبير قال ابن سيرين لااعلم من السنة القراءة خلف الامام.

(شرح مقنع جلد۲، ص۱۱)

اور مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے، اکثر اہلِ علم کا قول یہی ہے، اور جو اہلِ علم قرأت خلف الامام کے قائل نہیں تھے ان میں حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوسعید، حضرت زید بن ثابت، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت جابر، حضرت ابن عمر، حضرت حذیفہ بن الیمان ہیں، اور اسی کے قائل سفیان ثوری، سفیان بن عینیہ، اصحاب رائے اور امام مالک، امام زہری، اسود، ابراہیم اور سعید بن جبیر ہیں، اور ابن سیرین نے فرمایا کہ قرأت خلف الامام کے سنت ہونے کو میں نہیں جانتا۔

"ممن کان لایریٰ" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ واجب نہ کہنے والوں کی پوری فہرست نہیں ہے بلکہ ان میں سے چند اہم نام ذکر کر دیے گئے ہیں، نیز یہ کہ جس طرح امام احمدؒ نے فرمایا تھا کہ قرأۃ خلف الامام کے وجوب کا عالم اسلام میں کوئی قائل نہیں۔ اسی طرح

محمد بن سیرینؒ کے الفاظ سے واضح ہے کہ قرأت خلف الامام کا عمل خلاف سنت ہے۔

حضرت عبادہؓ کی روایت کے عموم سے استدلال

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمہور صحابہ وتابعین کا مسلک قرأت خلف الامام کا وجوب یا استحسان نہیں ہے اور حدیث پاک کے پورے ذخیرے میں ایک صحیح روایت بھی ایسی نہیں جس میں قرأت خلف الامام کے وجوب کی صراحت ہو، البتہ بعض روایات کے اجمال اور عموم سے اس مسلک پر استدلال کیا گیا ہے، جن میں سب سے مضبوط روایت حضرت عبادہؓ بن صامت کی ہے۔ **لاصلوۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب** اس میں دو جگہ عموم ہے ایک نکرہ نفی کے تحت ہے، جو ہر طرح کی نماز کو شامل ہے، دوسرے کلمۂ من جو ہر نمازی پر مشتمل ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی نمازی کی کسی بھی طرح کی نماز فاتحہ کے بغیر نہیں ہے۔ استدلال کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ اس عموم میں مقتدی بھی داخل ہے اور مقتدی کی نماز بھی فاتحہ کی قرأت کے بغیر صحیح نہیں ہے۔ اگر عموم کا یہ دعویٰ درست ہے تو ان لوگوں کے لیے استدلال کی گنجائش ہے اور اگر یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا تو ان کی بات کمزور ہے، اب ہمیں انصاف کے ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ اس روایت کے عموم میں مقتدی کو داخل ماننے کی بات میں کتنا وزن ہے؟

منصفانہ جائزے کی ضرورت اور اس کی بنیادیں

منصفانہ جائزے کی ضرورت اس لیے محسوس ہو رہی ہے کہ امام بخاری کی ذکر کردہ حضرت عبادہؓ کی روایت "**لاصلوٰۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب**" **قرات خلف الامام** کے بارے میں نص نہیں ہے، کیونکہ اس میں نہ مقتدی کا تذکرہ ہے، نہ خلف الامام کی قید ہے، اس لیے قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر استدلال کرنے والوں نے بھی اپنی بات مدلل کرنے کے لیے خارجی بحثوں سے کام لیا کہ یہاں کلمۂ من عام ہے، اور یہاں نکرہ نفی کے تحت ہے وغیرہ۔ اگر خلف الامام کی صراحت ہوتی تو ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی بالکل اسی طرح اس روایت کو خلف الامام کے مسئلہ سے غیر متعلق کہنے والوں نے بھی مضبوط

خارجی قرائن ذکر کیے ہیں، اس لیے انصاف کا تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک کی مراد کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے کچھ بنیادیں قائم کرلی جائیں تا کہ صحیح موازنہ کرنے اور درست فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ زیر بحث مسئلہ کے لیے مندرجہ ذیل نقاط کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

(۱) اس روایت کے دیگر طرق اور اس کے متابعات وشواہد سے حدیث کا کیا مفہوم متعین ہوتا ہے؟

(۲) اس روایت میں بہ سند صحیح آنے والے ''فصاعداً'' کے اضافہ کے بعد کا کیا مطلب متعین ہوتا ہے؟

(۳) اس حدیث کے راویوں نے عام طور پر روایت کو کس معنی پر محمول کیا ہے؟

(۴) اس موضوع سے متعلق قرآن کریم میں کیا ارشاد فرمایا گیا ہے؟

(۵) رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موضوع سے متعلق اس روایت کے علاوہ اور کیا ارشاد فرمایا ہے؟

(۶) رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے کس جانب کو ترجیح حاصل ہوتی ہے؟

(۷) صحابۂ کرامؓ نے اس روایت سے کیا سمجھا ہے اور کیا عمل کیا ہے؟

(۸) موضوع امامت واقتداء سے متعلق شریعت کی عام ہدایات کیا ہیں؟

اب ہم ذکر کردہ ان موضوعات سے متعلق گفتگو کو شروع کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ تفصیلی جائزے کے لیے وقت درکار ہے، اس لیے ہر عنوان کے بارے میں اختصار کے ساتھ عرض کیا جائے گا۔

(۱) حضرت عبادہؓ کی روایت کے دیگر طرق

اس روایت کے بارے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ دو طرح پر آئی ہے ایک مختصر اور ایک مفصل، صحاح کی مختصر روایت کے الفاظ تو آپ کے سامنے ہیں، مفصل روایت سنن میں یعنی ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہے، ابوداؤد کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

عن عبادة بن الصامت قال كنا خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم

فی صلوٰۃ الفجر فقرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فثقلت علیہ القرأۃ فلما فرغ قال لعلکم تقرء ون خلف امامکم قلنا نعم ھذاً یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لاتفعلوا الا بفاتحۃ الکتاب فانہ لاصلوۃ لمن لم یقرء بھا۔ (ابوداؤد جلد ۱، ص ۱۲۲)

حضرت عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے کہ ہم لوگ فجر کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کر رہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرأت کی، تو قرأت میں آپ کو گرانی ہوئی جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا، کہ شاید تم لوگ اپنے امام کے پیچھے قرأت کر رہے تھے، ہم نے عرض کیا جی ہاں! بہت تیزی کے ساتھ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا۔ قرأت نہ کیا کرو، البتہ صرف سورۂ فاتحہ پڑھ سکتے ہو اس لیے کہ جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

نماز فجر ہی کے واقعہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سوال میں یہ ہے ھل قرء معی احد منکم انفا (ترمذی ص ۷۱) کیا تم میں سے ابھی کسی نے میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ فقال رجل نعم تو جواب میں صرف ایک شخص نے اعتراف کیا کہ جی! میں نے کی ہے۔ پھر بعض روایات میں منازعت بعض میں مخالجت کا ذکر ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تمھاری قرأت سے مجھے خلجان واقع ہونے لگا یا نماز میں کشمکش کی صورت پیدا ہوگئی۔ یہ اس روایت میں ذکر کردہ بعض الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔ جن کی تشریح بعد میں کی جائے گی۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک مختصر بات ارشاد فرمائی تھی کہ حضرت عبادہؓ کی دو روایات ہیں۔ جن میں مختصر روایت صحیح ہے، مگر وہ قرأت خلف الامام کے بارے میں صریح نہیں ہے، اور سنن کی مفصل روایت ایک درجہ میں صریح ہے مگر صحیح نہیں جبکہ دعویٰ کے ثبوت کے لیے دونوں باتوں کا جمع ہونا ضروری ہے کہ روایت اپنے مدعا پر صریح بھی ہو اور صحیح بھی ہو۔ حضرت شیخ الہندؒ کی بات بڑی مختصر اور پسندیدہ و جامع ہے۔

مختصر روایت مفصّل کا جز ہے

حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد بجا، اور قرأت خلف الامام کا دعویٰ پیش کرنے والوں کے لیے مسکت جواب ہے کہ تم اپنے دعویٰ کے اثبات میں ناکام ہو، تم ہم سے صحیح اور صریح روایت طلب کرتے ہو، ہو سکے تو تم بھی اپنے مدعا کے لیے دونوں وصف کی حامل روایت پیش کرو یعنی جس کی صحت بھی مسلّم ہو اور اس میں قرأت مقتدی کی صراحت بھی ہو۔

اور اصلی بات یہ ہے کہ اگر چہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق یہ مستقل دو روایتیں ہیں، لیکن حقیقت ہے کہ روایت ایک ہی ہے، حافظ ابنِ حجرؒ کو بھی اس کا اعتراف ہے، حضرت گنگوہیؒ کا بھی یہی رجحان ہے یعنی مختصر روایت، کوئی مستقل روایت نہیں ہے بلکہ مفصل روایت کا ایک ٹکڑا ہے جسے الگ کر لیا گیا ہے اور اس کے عموم سے استدلال کیا جا رہا ہے جبکہ اصل مضمون یہ تھا کہ مفصل روایت میں یہ ٹکڑا سابق میں ذکر کردہ حکم کی علت کے طور پر لایا گیا تھا۔ لاتفعلوا الابام الکتاب فانہ لا صلٰوۃ لمن لم یقرء بھا، مطلب یہ تھا کہ امام کے پیچھے قرأت مت کرو، اور اگر پڑھنا ہی چاہتے ہو تو اباحتِ مرجوحہ کے طور پر صرف فاتحہ کی اجازت ہے اور اس کی اجازت بھی اس لیے دی جا رہی ہے کہ اس کی بہت اہمیت ہے کہ امام اور منفرد کی نماز تو اس کے بغیر ہوتی ہی نہیں، نیز یہ کہ مقتدی کے پڑھنے کی صورت میں امام سے منازعت کا امکان بہت کم ہے۔

اس تشریح کے مطابق حضرت عبادہؓ کی روایت کا مقصد مقتدی کے لیے فاتحہ کے وجوب کا بیان نہیں، بلکہ مقتدی کو قرأت سے منع کرنا ہے، لیکن منع کے باوجود، اباحتِ مرجوحہ کے طور پر قرأتِ فاتحہ کی اجازت دی گئی ہے، پھر اس اجازت کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ سورۂ فاتحہ کی مخصوص شان ہے اور وہ یہ کہ قرآن کی تمام سورتوں میں یہ امتیازی حیثیت صرف سورۂ فاتحہ کو دی گئی ہے کہ اس کی قرأت کو معین طور پر لازم کیا گیا ہے اور باقی سورتوں میں نمازی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ فاتحہ کے ساتھ جس سورت کو چاہے قرأت کے لیے منتخب کر لے۔

لیکن وجوب پر استدلال کرنے والوں نے مختصر روایت یعنی لا صلٰوۃ لمن لم یقرء الخ سے اس طرح استدلال کیا کہ کلمۂ "من" عام ہے جس کے تحت تمام نمازیوں، امام منفرد

اور مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور مفصل روایت سے استدلال اس طرح کیا کہ دیکھئے روایت میں مخاطب ہی مقتدیوں کو کیا گیا ہے **اتقرء ون خلف امامکم**۔ پھر انھی کو مخاطب کر کے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کی تلقین کرتے ہوئے **فانه لاصلوة لمن لم یقرء بها** فرمایا گیا ہے، اس لیے مقصد ثابت ہو گیا، لیکن یہ ان کی خوش فہمی ہے، غور کیا جائے تو اسی مفصل روایت سے قرأت کا وجوب تو درکنار، قرأت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

مفصل روایت میں منع قرأت کے قرائن

جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مختصر روایت مفصل روایت ہی کا آخری جز تھا، اور مفصل روایت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے روایت میں ذکر کردہ تمام مضامین کا احاطہ ضروری تھا۔ روایت میں متعدد ایسے قرائن موجود ہیں جن سے مقتدی کو قرأت سے باز رہنے کی تاکید سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً

(الف) پہلا قرینہ تو یہ ہے کہ پورے ذخیرۂ احادیث میں ایسی ایک روایت بھی پیش نہیں کی جا سکتی جس میں پیغمبر علیہ السلام نے ابتدائی طور پر صراحت کے ساتھ مقتدی کو قرأتِ قرآن یا قرأت فاتحہ کا حکم دیا ہو، حضرت عبادہؓ کی زیر بحث روایت میں سوال و جواب کا انداز بھی یہی بتا رہا ہے کہ کسی مقتدی کو پیغمبر علیہ السلام نے قرأت کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ مقتدیوں کا یہ عمل پیغمبر علیہ السلام کے علم میں بھی نہیں تھا، بعض مقتدیوں نے اتفاقاً اپنے طور پر یہ عمل اختیار کر لیا، منازعت اور خلجان کی صورت پیدا ہو گئی تو آپ نے باز پرس فرمائی، کیا تم امام کے پیچھے قرأت کر رہے ہو؟ **تقرء ون خلف امامکم** کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت کا حق نہیں ہے، اور جس نے بھی یہ عمل کیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری کے ساتھ اس پر انکار فرمایا ہے۔

(ب) دوسرا قرینہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کا عمل تمام مقتدیوں کا ہرگز نہیں ہو سکتا، کیونکہ پیغمبر علیہ السلام کی تو کوئی ہدایت نہیں، اور معاملہ ہے عبادات کا، جس میں اپنی رائے سے کوئی کام نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عبادت کے اعمال شارع علیہ السلام کی طرف سے معین کئے جاتے ہیں، اسی لیے روایات میں سوال و جواب کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ حقیقت

صاف ہوجاتی ہے کہ قرأت کا یہ عمل معدودے چند مقتدیوں کا ہے، بعض روایات کے الفاظ ہیں ہل قرء معی احد منکم انفا (ترمذی و ابوداؤد) کیا میرے ساتھ ابھی تم میں سے کسی نے قرأت کی ہے، سوال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام جانتے ہیں کہ یہ عمل سب کا نہیں ہوسکتا، نہ ہے، احدٌ، یا من احد کا لفظ ہے جو نکرۂ غیر معین پر دلالت کرتا ہے، پھر جواب پر غور کیجیے، بعض روایات میں تو قال بعضهم نعم وقال بعضهم لا ہے۔ لیکن بعض روایات میں تو فقال رجل نعم یارسول الله، اس روایت سے تو یہ معلوم ہوا کہ قرأت کرنے والا صرف ایک مقتدی تھا۔

(ج) تیسرا قرینہ یہ ہے کہ قرأت کرنے والے مقتدی بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے غلطی کی، وہ یہ نہیں کہتے کہ یارسول اللہ! اس میں کیا مضائقہ ہے، بلکہ وہ یہ کہتے ہیں ھذاً یا رسول الله! یارسول اللہ! قرأت تو کی ہے، مگر بڑی تیزی اور عجلت کے ساتھ منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی غلطی پر معذرت کریں۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے قرأت میں عجلت اختیار کر کے منازعت سے اور اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کی خلاف ورزی سے بچنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ یہ عذر حکم ورتّلِ القرآن ترتیلا کے پیش نظر درست نہیں تھا، لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باز پرس کی تو انھوں نے یہ کہا کہ ہم نے استماع کا سلسلہ ختم نہیں کیا ہے، استماع کو بھی باقی رکھا اور جلدی جلدی قرأت کا عمل بھی کرلیا جسے ہم اپنے طور پر مستحسن سمجھ رہے تھے۔

ان قرائن کا حاصل یہ نکلا کہ پیغمبر علیہ السلام کے پیچھے اپنے طور پر قرأت کرنے والے مقتدیوں کی تعداد، معدودے چند بلکہ بعض روایات کی رو سے تو صرف ایک ہے اور جب باز پرس کی گئی تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے قرأت جلدی جلدی کی ہے، تاکہ ہمارے سننے میں اور امام کی قرأت میں نقصان واقع نہ ہو۔ ان کے جواب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی غلطی کا در پردہ اعتراف کر کے یہ توجیہ کر رہے ہیں کہ جلدی جلدی پڑھنے میں شاید غلطی میں تخفیف کا پہلو نکل آئے، پھر آپ نے کیا ارشاد فرمایا؟ انداز دیکھتے جایئے، کیا آپ نے جواب میں یہ فرمایا کہ تم نے اچھا کیا؟ نہیں! روایت میں موجود ہے لاتفعلوا الا بفاتحة الکتاب الخ مطلب یہ ہے کہ جب یہ لوگ ایک چیز کو امر خیر سمجھ کر بطور خود اختیار کر بیٹھے؛

پیغمبر علیہ السلام نے دفعۃً روکنے کے بجائے تدریجاً روکنا مناسب سمجھا اور فرمایا کہ اگر ایسا ہی ہے کہ تم بھی کچھ قرأت کرنا چاہتے ہو تو خیر سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو یہ بات مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت سے بالکل واضح ہے جس میں فرمایا گیا **فقال ان کنتم لابد فاعلین فلیقرء احد کم فاتحة الکتاب بنفسه** ، یعنی اگر چاروناچار کچھ کرنا چاہتے ہو تو صرف سورۂ فاتحہ کو سراً یا دل ہی دل میں پڑھ لیا کرو۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ میری طرف سے حکم نہیں کہ تم یہ کام کرو مگر تم نے شروع کر دیا ہے اور شروع کیا بر بنائے رغبت، کہ قرأت کے بغیر دل نہیں مانتا تو خیر صرف فاتحہ پڑھ سکتے ہو۔ حاصل یہ نکلا کہ ابتداءً مقتدی کو قرأت کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ جب باز پرس کے بعد بعض حضرات کی شدید رغبت کا احساس ہوا تو ناپسندیدگی کے اظہار کے ساتھ اباحتِ مرجوحہ کے طور پر فاتحہ کی قرأت کی اجازت دے دی گئی، اس کو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا ہے کہ نہی سے استثناء مفید اباحت ہوتا ہے، لیکن یہاں مضبوط قرائن کی بنیاد پر اس کو اباحتِ مرجوحہ ہی قرار دیا جائے گا۔ وجوب کے استنباط کا یہاں تک کوئی قرینہ نہیں ہے۔

کیا وجوب کا کوئی اور قرینہ ہے؟

البتہ شوافع اور زمانۂ حال کے اہلِ حدیث کہہ سکتے ہیں کہ اگر حدیث کے الفاظ میں صرف **لاتفعلوا الابفاتحة الکتاب** ہوتا آگے کچھ نہ ہوتا تو آپ کے ذکر کردہ قرائن کی بنیاد پر اباحت کی بات قابلِ قبول ہوسکتی تھی لیکن ذرا آگے دیکھئے، حدیث کے الفاظ ہیں **فانه لاصلوة لمن لم یقرء بها** ، کہ جو فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہی نہیں ہوتی، یہ الفاظ، سابق میں ذکر کردہ حکم یعنی قرأت فاتحہ کی اجازت کی دلیل کے طور پر ارشاد فرمائے گئے ہیں، اور دلیل بتا رہی ہے کہ فاتحہ مقتدی کے حق میں بھی ضروری ہے یا فرض ہے۔ لیکن حقیقت کی تنقیح کے لیے حدیثِ پاک کے اس آخری جملہ پر کئی طرح غور کرنا ضروری ہے۔ مثلاً:

(الف) دعویٰ اور دلیل میں مطابقت:

ہم عرض کریں گے کہ ہاں اس سے دھوکا ہوسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کس دعوے کی دلیل ہے؟ ایک تو وہ دعویٰ ہے کہ جس کا پیغمبر علیہ السلام کے کلام میں کوئی ذکر یا

قرینہ نہ ہو اور جسے آپ خود قائم اور متعین کرلیں کہ مقتدی پر بھی فاتحہ فرض ہے اور پھر اس دعوے پر دلیل کو منطبق کریں، یہ بات تو قرین انصاف نہیں ہے۔

دوسرے وہ دعویٰ ہے جسے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے الفاظ سے سمجھا جائے پھر اسی کو دلیل پر منطبق کیا جائے تو یہ بات قرین انصاف اور معقول ہوگی، پیغمبر علیہ السلام کے کلام سے اباحتِ مرجوحہ کا دعوی مستنبط ہوا تھا کہ اگر تمھارا دل قرأت کے بغیر نہیں مانتا (**ان کنتم لابد فاعلین الخ**) تو صرف سورۂ فاتحہ کی اجازت ہے، یا یہاں **لاتفعلوا الابفاتحۃ الکتاب** فرمایا گیا ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے **لاتدخلوا بیوت النبی الاان یوذن لکم** (احزاب ۵۳) کہ پیغمبر علیہ السلام کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، الا یہ کہ تم کو اجازت دے دی جائے، جیسے یہاں اجازت کے بعد داخل ہونا لازم نہیں صرف اباحت ہے، اسی طرح **لاتفعلوا** کی نہی کے بعد **الابفاتحۃ الکتاب** کا استثناء صرف اباحت بتا رہا ہے۔

اب بات یہ ہوئی کہ **فانہ لاصلوۃ الابھا**، دلیل تو ہے، مگر دلیل وجوبِ فاتحہ کی نہیں اس لیے کہ وجوب کا دعویٰ سابق میں نہیں کیا گیا ہے، سابق میں دعویٰ اباحت کا بلکہ اباحتِ مرجوحہ کا ہے تو یہ اسی کی دلیل بنے گی۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب مقتدی کو قرأت سے منع کردیا گیا، ناگواری ظاہر کی گئی تو سورۂ فاتحہ کو اباحتِ مرجوحہ کا درجہ دینا بھی محتاجِ دلیل ہوگیا یعنی جب امام کے پیچھے قرأت کی ضرورت نہیں رہی تو سورۂ فاتحہ کی کیا خصوصیت ہے کہ اس کو کسی بھی درجہ میں مباح قرار دیا جائے، چنانچہ فرمایا گیا کہ اس کی ایک ممتاز شان ہے کہ نماز میں فاتحہ علی سبیل التعیین مطلوب ہے جبکہ قرآن کی دوسری سورتوں کا یہ حکم نہیں، اسی مضمون کو حضرت عبادہؓ کی دارقطنی وحاکم وغیرہ کی ایک مرفوع روایت میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے **ام القرآن عوض عن غیرھا ولیس غیرھا منھا بعوض** کہ سورۂ فاتحہ دیگر سورتوں کا بدل بن جاتی ہے لیکن کوئی دوسری سورت فاتحہ کا عوض نہیں بنتی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ **فانہ لاصلوۃ الخ** میں سورۂ فاتحہ کی خصوصیت اور امتیازی شان بیان کی گئی ہے تاکہ مقتدی کو قرأت سے ممانعت کے باوجود، فاتحہ کے سلسلے میں دی گئی اباحت کا سبب معلوم ہو جائے جبکہ شوافع نے اس آخری جملے سے یہ سمجھ لیا کہ فاتحہ بحق مقتدی ضرور ہے، حالانکہ ضرورت اور وجوب سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

(ب) لمن لم يقرء کا مصداق کون ہے؟

دوسری بات یہ کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے **لمن لم يقرء بها** اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے جس نمازی کو قرأت فاتحہ کا مکلف بنایا ہے وہ قرأت نہ کرے، یعنی فاتحہ کو چھوڑ کر باقی پورا قرآن پڑھ جائے تو شریعت کی نظر میں اس کی نماز کالعدم اور واجب الاعادہ ہے، رہی یہ بات کہ قرأتِ فاتحہ کا مکلف کس کو بنایا گیا ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے کہ اس سلسلے میں کسی کو اپنی طرف سے کہنے کا حق نہیں، یہ بات تو انھی سے پوچھنے کی ہے، جنھوں نے **لا صلوة لمن** الخ فرمایا ہے جیسا کہ تمام اختلافی معاملات میں **فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول** (النساء ۵۹) کے مطابق خدا اور رسولِ خدا کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے، ہم نے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ امام اور منفرد کو اس کا مکلف بنایا گیا ہے، مقتدی سے اس کا تعلق نہیں، مقتدی کے لیے تو حدیثِ صحیح میں فرمایا گیا ہے **اذا قرء فانصتوا** اور قرآن کریم میں بھی **اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا** کہہ کر مقتدی کو قرأت سے روکا گیا ہے، حضرت جابرؓ سے ترمذی شریف میں اور طحاوی شریف میں روایت ہے **من صلی رکعۃ لم يقرء فيها بام القرآن فلم يصل الا ان يكون وراء الامام هذا حديث حسن صحيح** (ترمذی جلد۱، ص ۷۱) **الا ان يكون وراء الامام** میں تصریح ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی مگر اس حکم کا تعلق، مقتدی کے علاوہ دیگر نمازیوں سے ہے۔

ان روایات پر اور قرآن کریم کی آیت پر بحث تو بعد میں ہوگی، مگر ان باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ شریعت میں انفراد، امامت اور اقتداء کے ابواب الگ الگ ہیں، حضرت عبادہ کی روایت میں **لمن لم يقرء** کو عام قرار دے کر مقتدی کو اس کے تحت داخل کرنا، ایک باب کے احکام کو دوسرے باب پر نافذ کرنے کے مرادف ہے۔

شریعت میں اس کی متعدد نظیریں ہیں، مثلاً بیع ہے شریعت نے اس کے اصول مقرر فرمائے ہیں لیکن بیع سلم کو اس سے مستثنیٰ کر کے مستقل حیثیت دی گئی ہے، اب اگر کوئی بیع سلم پر مطلق بیع کے احکام نافذ کرے تو بیع سلم ختم ہو جائے، اسی طرح شریعت میں ایک اصول مقرر ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر کسی کی ملک میں تصرف کرنا جائز نہیں، لیکن

شفعہ کو الگ حیثیت دی گئی ہے، ایک شخص نے مکان خریدا بیع تام ہوگئی وہ مالک ہوگیا، لیکن دوسرا آدمی شفعہ کے حق کی بنیاد پر زبردستی دوسرے کے حق میں تصرف کا دعوے دار ہوگیا، یہی کہا جائے گا کہ شریعت نے دو الگ الگ ابواب قائم کئے ہیں اور ایک باب کے احکام دوسرے باب پر نافذ کرنا شریعت کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا ہے، اسی طرح اقتداء کا باب بالکل الگ ہے اور حدیث کے الفاظ من لم یقرء بھا کی تشریح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ احکام کے مطابق یہی ہے کہ مقتدی سے قرأتِ فاتحہ کا تعلق نہیں۔

(ج) مقتدی کے قاری ہونے کا مطلب:

تیسری بات یہ ہے کہ حدیث میں جو من لم یقرء فرمایا گیا ہے تو آپ نے یہ کیسے سمجھا کہ استماع وانصات کے حکم کی تعمیل کرنے والا مقتدی قاری نہیں ہے؟ ظاہر ہے آپ کا یہ سمجھنا معنیٰ لغوی کی بنیاد پر ہے کہ قاری وہ ہے جو قرأت کرے، ہم عرض کریں گے کہ امور شرعیہ میں معنیٰ لغوی پر اعتماد بھی اگر چہ صحیح ہے مگر پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے شریعت میں بیان کردہ معانی کو اولیت حاصل ہے اس لیے ہم نے لغت کے بجائے اس سلسلہ میں پیغمبر علیہ السلام کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ مقتدی کو خاموشی کی حالت میں بھی قاری مانا گیا ہے، **من کان له امام فقراء ة الامام له قراء ة** روایت پر گفتگو بعد میں آئے گی، اسی طرح موطا میں ابن عمرؓ کا ارشاد موجود ہے **اذا صلی احدکم خلف الامام فحسبه قراء ة الامام۔** پیغمبر علیہ السلام کے ارشادات کا حاصل یہ ہے کہ مقتدی کو خاموشی کی حالت میں بھی قاری تسلیم کیا گیا ہے جیسے باکرہ سے نکاح کی اجازت طلب کرتے ہیں تو وہ شرم وحیا کی وجہ سے زبان سے کچھ اظہار نہیں کرتی، مگر اس فطری عذر کے سبب اس کے سکوت کو تکلم کی طرح تسلیم کیا گیا ہے، تاری میں آئے گا، **فقیل یا رسول اللہ کیف اذنها قال اذا سکتت** (بخاری جلد۲، ص ۱۰۳۰)

اسی بات کو شیخ ابن ہمام نے اپنے انداز میں اس طرح لکھا ہے **بل یقال القراء ة ثابتة من المقتدی شرعا فان قراء ة الامام قراء ة له فلو قرء کان له قراء تان فی صلٰوة واحدة وهو غیر مشروع** (فتح القدیر جلد ۱، ص ۲۹۵) بلکہ یہ کہا جائے گا کہ مقتدی کا قاری ہونا شرعاً ثابت ہے اس لیے کہ امام کی قرأت کو مقتدی کی قرأت تسلیم کیا گیا ہے پس

اگر مقتدی قرأت کرے گا تو اس کی ایک نماز میں دو قرأتیں ہو جائیں گی اور یہ غیر مشروع ہے۔

(د) سیاق و سباق سے وجود نہیں نکلتا:

چوتھی بات حضرت علامہ کشمیریؒ نے ارشاد فرمائی ہے کہ **فانہ لاصلوٰۃ لمن یقرء بھا** کا مقتدی پر فاتحہ کے وجوب سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو اس کو زمانۂ ماضی میں واجب قرار دیے جانے کی خبر کہا جائے گا، یا یہ کہا جائے گا کہ پہلے تو واجب نہیں تھا، خطاب کے وقت زمانۂ حال میں واجب کیا جا رہا ہے اور یہ دونوں احتمال درست نہیں، کیونکہ اگر یہ زمانۂ ماضی کی خبر ہے تو صحابۂ کرام سے اس سوال کا کیا موقع ہے کہ شاید تم قرأت کر رہے تھے، پھر یہ کہ اگر سوال کی کوئی وجہ ایجاد بھی کر لی جائے تو صحابہ کو جواب میں معذرت یا شرمندگی کی کیا ضرورت ہے، تمام صحابہ کو بیک زبان یہ کہنا چاہیے تھا کہ یا رسول اللہ! اس کی قرأت کو تو آپ نے ضروری قرار دیا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا، یہ سوال و جواب بتا رہا ہے کہ زمانۂ ماضی میں تو اس کو کسی وقت بھی ضروری قرار نہیں دیا گیا تھا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس کو زمانۂ حال میں ضروری قرار دیا جا رہا ہو تو اس صورت میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسی وقت ضروری قرار دیا جا رہا ہے اور اسی وقت ناگواری کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے، ایسی صورت ہوتی تو آپ کو صحابۂ کرام کے اس عمل پر ہمت افزائی کرنی چاہیے تھی کہ ضروری تو اب ہم قرار دے رہے ہیں لیکن تم شریعت کے ایسے مزاج شناس ہو کہ پہلے ہی وہ کام شروع کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، اور جب نہ زمانۂ ماضی میں ضروری قرار دینے کی کوئی صحیح توجیہ ہو رہی ہے نہ حال میں تو کیسے سمجھا جائے کہ **فانہ لاصلوٰۃ** کا تعلق مقتدی پر فاتحہ کے وجوب سے ہے۔ پھر یہ کہ اتنے بڑے دعوے کے لیے۔ یعنی زمانۂ ماضی یا زمانۂ حال میں فاتحہ کو واجب کہنے کے لیے حدیث پاک سے کوئی ثبوت تو پیش کرو، ایسا ہوا ہوتا تو ضرور ذخیرۂ حدیث میں کوئی چیز محفوظ ہوتی؟

ان چاروں باتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث کا آخری جملہ **فانہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرء بھا** مقتدی پر فاتحہ کے وجوب کی دلیل نہیں، اس لیے کہ وجوب کا دعویٰ کیا ہی نہیں گیا ہے صرف اباحت کا دعویٰ مستنبط ہوتا ہے یہ اسی کی دلیل ہے کہ مقتدی کو قرأت کی اجازت نہیں البتہ سورۂ فاتحہ کو امتیازی شان کی وجہ سے مباح کر دیا گیا ہے، نیز یہ کہ روایاتِ صحیحہ کی

روشنی میں اس کا تعلق مقتدی سے نہیں ہے مزید یہ کہ مقتدی سے قرأت کا تعلق اگر ہے تو اس سے حسّی اور لغوی قرأت مراد نہیں، بلکہ شرعی قرأت مراد ہے، پھر یہ کہ واجب قرار دیتے ہیں، تو حدیث کے سیاق وسباق سے زمانۂ ماضی یا حال میں اس کی تائید تو کیا ہوتی اس اشکال کی جواب وہی دشوار نظر آتی ہے کہ ایک طرف واجب بھی قرار دیا جائے اور دوسری طرف قرأت کا عمل کرنے والے مقتدیوں کے عمل پر اظہارِ ناگواری کے ساتھ انکار بھی کیا جائے؟

بیہقیؒ کی تاویل

یہاں یہ بات بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے پر جن روایات میں اظہارِ ناپسندیدگی کیا گیا ہے، بیہقی وغیرہ نے ان کی دو تاویلیں کی ہیں، ایک تاویل تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری کا اظہار قرأت پر نہیں کیا بلکہ جہر پر کیا ہے، گویا ناگواری کا اظہار اصل قرأت پر نہیں بلکہ قرأت کے وصف پر ہے اور دوسری تاویل یہ کہ ناگواری کا اظہار قرأتِ فاتحہ پر نہیں مازاد علی الفاتحة پر ہے لیکن اس طرح کی تاویلات کو بات بنانے کی کوشش سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ مثلاً پہلی تاویل کے بارے میں مندرجہ ذیل حقائق کا پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔

(الف) ایک بات تو یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ **لعلکم تقرؤن خلف امامکم** ہیں، **لعلکم تجھرون خلف امامکم** نہیں ہیں، یعنی آپ کے الفاظ سے ناگواری کا اظہار جہر پر نہیں بلکہ صراحت کے ساتھ نفسِ قرأت پر ثابت ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناگواری کی بنیاد منازعت ہے لیکن منازعت کے لیے مقتدی کی جانب سے جہر کا ہونا ضروری نہیں، پھر ہم بے ضرورت تقرؤن کو تجھرون کے معنی پر کیوں محمول کریں؟

(ب) نیز یہ کہ انکار کا مدار جہر کو قرار دیں تو فطری طور پر پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ پیغمبر علیہ السلام نے مقتدی کو سری قرأت کی اجازت دی تھی، اگر یہ ہدایت کہیں موجود ہو تو چلئے جہر ہی کو مدارِ انکار بنالیا جائے، اور اگر یہ ہدایت ذخیرۂ احادیث میں نہیں ہے تو نفسِ قرأت کی صراحت کے باوجود جہر کو کیسے مدار قرار دیا جائے؟

(ج) پھر یہ کہ جہر کی بنیاد پر انکار کیا گیا ہوتا تو پیغمبر علیہ السلام قرأت کے بارے میں شبہ کا اظہار کرتے ہوئے لعلکم تقرؤن باھل قوء وغیرہ نہ فرماتے، کیونکہ جہر کی تو آواز ہوتی ہے جس سے قرأت کا یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں صرف قاری کے تعین کے بارے میں سوال کیا جاسکتا تھا یعنی سوال ہونا چاہیے تھا من قرء یا من جہر، کہ قرأت کون کر رہا تھا وغیرہ۔

(د) مزید یہ کہ عقلاً بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سب مقتدی خاموش ہوں اور ایک دو آدمی جہر شروع کر دیں، صحابۂ کرام سے اس طرح کی امید نہیں کی جاسکتی۔

یہ باتیں تو پہلی تاویل کے بارے میں ہوئیں، دوسری تاویل کہ انکار سورۂ فاتحہ کی قرأت پر نہیں بلکہ مازاد کی قرأت پر ہے، تو یہ بات بھی متعدد وجوہ کی بنا پر قابلِ قبول نہیں ہے۔ مثلاً:

(الف) پہلی بات تو یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے ارشاد لعلکم تقرؤن خلف امامکم میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے جس کی بنیاد پر آپ کے انکار کا تعلق مازاد سے قائم کیا جائے، شاید اس تاویل کو پیش کرنے والوں کی نظر حضرت عمران بن حصین کی اس روایت پر ہے جس میں کسی نے ظہر کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سبح اسم ربک الاعلیٰ کی قرأت کی تھی اور آپ نے ایکم قرء کہہ کر انکار فرمایا تھا، مگر اس استدلال کی حیثیت غلط فہمی سے زیادہ نہیں۔

کیونکہ آپ کے انکار کی وجہ سبح اسم یا کسی سورۃ کی قرأت نہیں، روایات کے اکثر اور قابلِ اعتبار طرق میں مدارِ انکار مطلق قرأت کو بنایا گیا ہے، پھر یہ کہ یہاں دو واقعات الگ الگ ہیں، حضرت عبادہؓ کی زیرِ بحث روایت کا تعلق نماز فجر سے ہے اور حضرت عمرانؓ کی روایت جس میں سبح اسم الخ کی قرأت کا ذکر ہے۔ کا تعلق نماز ظہر سے ہے جو سری ہے۔ سری نماز میں سبح اسم الخ کے جہر کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ جہر یا مازاد علی الفاتحۃ سے انکار کا تعلق قائم کیا جائے صاف بات یہی ہے کہ کسی مقتدی کے ارتکابِ کراہت۔ یعنی قرأت خلف الامام۔ کی بنیاد پر انکار فرمایا گیا، جیسے بعض روایات میں یہ آتا ہے کہ کسی مقتدی کی طہارت کے سلسلے میں کوتاہی کا آپ کے قلبِ مبارک پر اثر ہوا اور

آپ نے ارشاد فرمایا ما بال اقوام یصلون معنا لایحسنون الطھور و انما یلبس علینا القرآن أولئک۔

(ب) دوسری بات یہ ہے کہ انکار کو ما زاد سے متعلق قرار دینا، محض احتمال کی بنیاد پر تو ثابت نہیں ہوتا، یہ تو ایک دعویٰ ہے جو روایت کے سیاق وسباق کے منافی ہے اور اس طرح کے دعووں کو ثابت کرنے کے لیے مضبوط دلیل کی ضرورت ہے، اور یہاں مضبوط تو کجا، ضعیف دلیل بھی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبادہؓ کی روایت سے مقتدی کے لیے فاتحہ کا وجوب کسی بھی طرح ثابت نہیں ہوتا، صرف اباحتِ مرجوحہ نکل سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں کو اظہارِ ناراضگی کے ساتھ اجازت دی ہے لیکن وجوب کا قول اختیار کرنے والوں نے اپنی فہم سے ایک نظریہ قائم کرلیا پھر اس پر روایات کو منطبق کرنے کے لیے تکلف بلکہ زبردستی سے کام لیا، اور جو دلائل اپنے نظریہ کے خلاف نظر آئے ان میں بیجا تاویل شروع کردی۔

(۲) حضرت عبادہؓ کی روایت میں فصاعداً کا اضافہ

یہاں تک کے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبادہؓ کی مختصر روایت کو مفصل روایت کی روشنی میں سمجھنے سے یہ ثابت ہوا کہ اس روایت سے مقتدی کے حق میں فاتحہ کے وجوب پر استدلال کرنا درست نہیں، اب اس روایت پر ایک اور زاویہ سے غور کرنا ہے اور وہ یہ کہ روایت کے الفاظ صرف لاصلوۃ الابفاتحۃ الکتاب ہیں یا اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے، تو مسلم، ابوداؤد اور ابنِ حبان میں اس کے بعد لفظ فصاعداً بھی ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اس اضافہ کے بعد ظاہر ہے کہ لاصلوۃ کا حکم صرف سورۂ فاتحہ سے نہیں بلکہ مجموعہ سے متعلق مانا جائے گا اور نفیِ صلوٰۃ کا تعلق صرف ترکِ فاتحہ سے نہیں، بلکہ مجموعہ کے ترک سے ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ نماز میں مطلق قرأت مطلوب ہے جیسا کہ قرآن میں فاقرؤا ماتیسر من القرآن، اور مسیئ فی الصلوۃ کی روایت میں ثم اقرأ ما تیسر معک من القرآن فرمایا گیا ہے۔ البتہ اس مطلق قرأت میں یہ تفصیل ہے کہ سورۂ فاتحہ معین ہوکر لازم

کی گئی ہے اور فصاعدا یا ماتیسر میں غیر معین طور پر یہ اختیار دیا گیا ہے کہ نمازی کسی بھی سورت کو یا قرآن کریم کے کسی بھی حصے کو فاتحہ کے ساتھ شامل کر سکتا ہے، گویا مطلق قرأت کی تفصیل میں جو درجہ سورۂ فاتحہ کو دیا جائے گا وہی درجہ ضم سورت کو بھی دیا جائے گا جیسا کہ حنفیہ نے دونوں کو واجب قرار دیا ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک ہی سیاق میں دو چیزوں کو عطف کے ساتھ ذکر کیا جائے اور ان دونوں کے درجہ میں فرق کر دیا جائے یہ کیسے ممکن ہے کہ لاصلوٰۃ کو سورۂ فاتحہ کے حق میں رکنیت کی دلیل قرار دیا جائے اور فصاعداً کے حق میں وہ رکنیت کی دلیل نہ بنے، جیسا کہ شوافع نے کر رکھا ہے۔ سچ پوچھیے تو جن لوگوں نے معطوف علیہ میں نفی ذات، اور معطوف میں نفی کمال کے معنی لیے انھوں نے صحیح معنی میں روایت پر عمل نہیں کیا اور نہ عربی زبان کے قواعد مطردہ کی رعایت کی، روایت پر عمل انھی لوگوں نے کیا جنھوں نے سوق کلام اور عربی زبان کے قواعد کے مطابق روایت کے دونوں اجزاء کو برابر کے درجہ میں رکھا اور سورۂ فاتحہ کے ساتھ فصاعداً کو بھی واجب قرار دیا۔

اور جب روایت کا یہ مفہوم متعین ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ ضم سورت کو بھی لازم کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس روایت کا تعلق ایسے نمازی سے نہیں جس کو صرف سورۂ فاتحہ کی۔ اور وہ بھی ناگواری کے ساتھ۔ اجازت دی گئی ہے، یعنی اب دیانت کے ساتھ غور کیجیے کہ ان معانی کی وضاحت کے بعد روایت کا کیا رُخ متعین ہوا؟ اور کیا روایت کو مقتدی سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے، جسے شوافع کے یہاں فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے فصاعداً کی نہیں۔

اضافہ پر دو اعتراض

فصاعداً کے اضافہ کے بعد روایت کا تعلق مقتدی سے قائم ہی نہ رہا، تو اس اضافہ پر بحث شروع ہو گئی، امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ میں اس پر دو اعتراض کیے ہیں، پھر دوسرے علماء بھی انھی کو نقل کرتے رہے ہیں۔

ایک اعتراض تو یہ ہے کہ عامۃ الثقات لم تتابع معمرا الخ کہ عام طور پر ثقہ راویوں نے معمر کی متابعت نہیں کی اور فصاعداً غیر معروف ہے یعنی معمر اس روایت میں متفرد ہیں دوسرا اعتراض یہ کہ اگر اس لفظ کو کسی درجہ میں تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ استعمال بالکل

لایقطع الید الا فی ربع دینار فصاعداً کی طرح ہے کہ چوری کی سزا ربع دینار میں بھی قطع ید ہے اور اس سے زائد میں بھی قطع ید ہے یعنی حد سرقہ کے اجراء کے لیے مالیت کا ربع دینار ہونا ضروری ہے، اس سے زیادہ غیر ضروری ہے، اسی طرح لاصلوٰۃ الا الخ میں نماز کی تمامیت کے لیے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے، فصاعداً غیر ضروری ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب

فصاعداً پر کیے گئے اس اعتراض کو محدثین کے طے کردہ اصول کے مطابق کسی طرح کی اہمیت نہیں دی جاسکتی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(الف) راوی کا تفرد اس صورت میں مضر قرار دیا گیا ہے جب ثقہ راوی کی روایت اوثق کے مخالف ہو اور یہاں ایسا نہیں ہے، معمر بن راشد کے بارے میں ابن معین فرماتے ہیں هو اثبت الناس فی الزهری، امام زہری کے تلامذہ میں معمر مضبوط تر راویوں میں ہیں۔ علی بن مدینی اور ابو حاتم فرماتے ہیں هو فیمن دار الاسناد علیهم (تہذیب جلد ۱۰، ص ۲۴۴) یہ ان مرکزی راویوں میں ہیں جن پر اسناد کا مدار ہے، اس لیے اگر وہ متفرد بھی ہوں تو ان کی روایت کو اصول محدثین کے مطابق قبول کرنا ضروری ہے، چنانچہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ روایت معمر ہی سے نقل فرمائی ہے۔

(ب) دوسری بات یہ کہ معمر متفرد نہیں ہیں، ایک متابعت تو خود امام بخاری نے جزء القرأۃ میں ذکر کی ہے قال البخاری ویقال ان عبدالرحمن بن اسحاق تابع معمرا الخ (جزأ لقراءۃ ص ۴) اگرچہ امام بخاری نے اس متابعت کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن اسحاق کبھی زہری سے بلاواسطہ نقل کرتے ہیں اور کبھی بالواسطہ اور ہم نہیں جانتے کہ هذا من صحیح حدیثه ام لا یعنی یہ متابعت ان کی صحیح حدیثوں میں سے ہے یا نہیں؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر امام بخاری کو سند صحیح سے متابعت مل جاتی تو وہ اس کو قبول کر لیتے، اگرچہ اصول محدثین میں متابعت کا بہ سند صحیح ہونا ضروری نہیں، متابعت میں اگر کچھ کمزوری بھی ہو تو اس کو رد نہیں کیا جاتا۔ لیکن سند صحیح کے ساتھ متابعت کی قید ہے تو وہ بھی موجود ہے، ابوداؤد میں ہے۔ حدثنا قتیبة بن سعید وابن السرح قالا نا

سفیان عن الزھری عن محمود بن الربیع عن عبادۃ بن الصامت یبلغ بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لاصلوۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب فصاعداً، قال سفیان لمن یصلی وحدہ (ابوداؤد جلد ا، ص ۱۱۹) سند کے تمام رجال ثقہ اور صحیح کے راوی ہیں، اب زہری سے فصاعداً کی روایت کرنے والے دو امام ہوگئے، ایک معمر اور دوسرے سفیان بن عیینہ۔

پھر یہ کہ انھی دو پر انحصار نہیں بلکہ امام اوزاعی، شعیب بن ابی حمزہ، عبدالرحمٰن بن اسحاق مدنی اور صالح بن کیسان نے بھی فصاعداً کی نقل میں ان کی متابعت کی ہے، حضرت علامہ کشمیریؒ نے فصل الخطاب میں ان متابعات کو حوالوں کے ساتھ نقل فرمایا ہے، اتنے راویوں کی متابعت کے بعد معمر کے تفرد کا دعویٰ کیسے قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔

(ج) تیسری وجہ یہ ہے کہ ذخیرۂ احادیث میں فصاعداً کے شواہد بہ کثرت موجود ہیں، ابوسعید خدری سے ابوداؤد میں امرنا ان نقرأ بفاتحۃ الکتاب و ما تیسّر اور حضرت ابوہریرہؓ سے امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان انادی انہ لاصلوۃ الابقراءۃ فاتحۃ الکتاب و مازاد (ابوداؤد جلد ا، ص ۱۱۸) موجود ہے، ترمذی اور ابن ماجہ میں وسورۃ معھا کے الفاظ ہیں اور بیہقی کی کتاب القراءۃ میں اس کے ہم معنی متعدد الفاظ منقول ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ فصاعداً کے اضافہ کو محدثین کے اصول کے مطابق صحیح قرار دینا ضروری ہے کہ اس کے راوی ائمۂ حدیث ہیں، اس کی متابعات اور اس کے شواہد اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے اس کی صحت میں شبہ کرنا اصولِ محدثین سے انحراف کے ہم معنی ہے، امام بخاری کی طرف سے یہ عذر کیا جاسکتا ہے کہ وہ ان متابعات پر مطلع نہیں تھے، نیز یہ کہ اس زمانہ میں اصولِ حدیث بھی پوری طرح مدوّن نہیں ہوئے تھے۔ لیکن شوافع اور عہد حاضر کے اہل حدیث جو آج تک اس اعتراض کو دہراتے رہتے ہیں تو ہم اس کی معقولیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ واللہ اعلم۔

دوسرے اعتراض کا جواب

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ فصاعداً کو اگر تسلیم بھی کرلیں تو یہ لاتقطع الید الافی

ربع دینار فصاعداً کی طرح ہے، امام بخاری نے اس مثال کے ذریعہ اپنا طریقۂ استدلال پوری طرح واضح نہیں کیا، صرف اتنا لکھا فقد یقطع الیدفی دینار وفی اکثر من دینار کہ چور کا ہاتھ ایک دینار میں بھی کاٹا جاتا ہے اور ایک دینار سے زائد میں بھی، اس کی وضاحت یہ ہے کہ فصاعداً حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا استعمال لغتِ عرب میں ایسے موقع پر ہوتا ہے جب ذکر کردہ حکم کو ماقبل میں ضروری اور مابعد میں اختیاری قرار دیا گیا ہو جیسے لا تقطع الیدا لافی ربع دینار فصاعدا کہ چور کا ہاتھ کاٹنے کے لیے ربع دینار کی چوری تو ضروری ہے فصاعداً یعنی ربع دینار سے زیادہ ہو یا نہ ہو، اسی طرح لاصلوۃ الابفاتحۃ الکتاب فصاعداً میں سورۂ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے، فصاعداً یعنی سورۂ فاتحہ کے علاوہ قرأت ہو یا نہ ہو۔

لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ نے لغتِ عرب سے جو فصاعداً کا استعمال پیش کیا ہے کہ وہ ماقبل میں حکم کے ایجاب اور مابعد میں تخییر کے لیے آتا ہے یہ استعمال ہر جگہ مطرد نہیں ہے، مثلاً حضرت علیؓ سے روایت میں قال امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نستشرف العین والاذن فصاعداً، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم قربانی کے جانور کے آنکھ اور کان، پھر اس سے زیادہ کو یعنی دیگر اعضاء کو دیکھ لیا کریں کہ ان میں عیب تو نہیں ہے، تو کیا مندرجہ بالا استعمال کی رو سے یہ معنی درست ہوں گے کہ آنکھ اور کان کے عیب سے خالی ہونے کو دیکھنا تو ضروری ہے، اور دیگر اعضا میں اختیاری؟ ظاہر ہے کہ یہ معنی نہیں ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آنکھ اور کان کا غور سے دیکھنا ضروری ہے، اسی طرح دیگر اعضاء کے بھی عیب سے سالم ہونے کو دیکھنا ضروری ہے۔

اس لیے صحیح بات ہے کہ کلام عرب میں فصاعداً ماقبل کے حکم۔ خواہ وہ وجوب ہو یا اباحت ہو یا تخییر ہو وغیرہ۔ کو مابعد تک ممتد کرنے کے لیے آتا ہے یعنی یہ بتلانے کے لیے آتا ہے کہ مابعد بھی ماقبل ہی کے حکم میں داخل ہے، اور یہ بات فصاعداً کے تمام استعمالات میں مطرد ہے استعمال کی اس وضاحت کے مطابق لاصلوۃ الابفاتحۃ الکتاب فصاعداً کے معنی یہ ہوئے کہ نماز میں ماقبل کے حکم میں مابعد بھی داخل ہے یعنی سورۂ فاتحہ کا جو حکم ہے وہی فصاعداً کا بھی ہے کہ مثلاً حنفیہ کے یہاں یہ دونوں واجب ہیں۔

رہی اس استعمال کے مطابق امام بخاری کی پیش کردہ مثال لاتقطع الایدی الخ کی وضاحت تو وہ بھی آسان ہے، محض تعبیر کا فرق ہے، مطلب یہ ہے کہ قطع ید کا حکم ربع دینار سے شروع اور نافذ ہوتا ہے اور یہ حکم فصاعدا تک ممتد ہے کہ چوراس سے زیادہ کتنی بھی مقدار کی چوری کرے یہی حکم برقرار رہے گا، مثلاً کسی نے دس دینار کی چوری کی تو امام بخاری کے استدلال کے مطابق تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ قطع ید کی سزا ربع دینار پر ہے باقی کا کوئی اثر نہیں یعنی فصاعداً یا مازاد کا اس سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ یہ بات قطعاً غیر معقول ہے کہ ربع دینار پر تو ہاتھ کاٹ دیا جائے اور زائد کی کوئی سزا نہ ہو، اور ہمارے استدلال کے مطابق مطلب یہ ہوگا کہ قطع ید کی سزا ربع دینار سے کم پر نہیں، یعنی یہ ربع دینار سے شروع ہوتی ہے اور اگر چوری کی مقدار اس سے زیادہ ہو تب بھی قطع ید کا یہی حکم ممتد کر دیا جاتا ہے اور قطع ید کی یہ سزا مجموعہ سے متعلق ہو جاتی ہے۔

اسی طرح سے لاصلوٰۃ الابفاتحۃ الکتاب فصاعداً کا مطلب یہ ہوگا کہ نماز میں مطلق قرأت جو فرض کا درجہ رکھتی ہے کہاں سے شروع ہوتی ہے، فرمایا گیا کہ وہ سورۂ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اور پھر قرأت کو جہاں تک بھی لے جاؤ اس کا حکم وہی رہے گا جو سورۂ فاتحہ کا ہے، حنفیہ کے یہاں ایسا ہی ہے کہ نماز میں جتنی بھی قرأت کی جائے گی سب کا حکم ایک ہی ہے، یہ نہیں کہ ایک خاص مقدار تک اس کو واجب کہا جائے اور باقی کو اس سے الگ کر دیا جائے، مثلاً کسی شخص نے سورۂ فاتحہ کے بعد ایک سیپارہ پڑھا تو یہ نہیں ہے کہ اس کی کوئی مقدار واجب ہو باقی کا حکم الگ ہو اور اس مقدار واجب کے بعد کوئی ایسی غلطی ہو جائے جس سے کراہت یا فساد آتا ہو تو یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مقدار تو زائد تھی اس غلطی کا کوئی نقصان نہیں، کسی فقیہ کا یہ مسلک نہیں ہے۔ اس تفصیل کے مطابق یہ ماننا ہوگا کہ سورۂ فاتحہ کے بعد جتنا قرآن بھی پڑھا جائے گا اس کا وہی حکم ہوگا جو سورۂ فاتحہ کا ہے کہ اسی کے حکم کو مابعد تک ممتد کیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے وہ مغالطہ دور ہو جاتا ہے جو امام بخاری کی پیش کردہ لاتقطع الایدی الخ والی مثال سے پیدا ہوتا ہے، حضرت علامہ کشمیری قدس سرہٗ نے تو اس کے کئی تحقیقی جوابات دیئے ہیں اور ہماری پیش کردہ تفصیل بھی دراصل انھی کے بیان کردہ ایک

جواب کی تسہیل ہے۔

نیز یہ کہ امام بخاریؒ کی پیش کردہ حدسرقہ والی مثال میں تو صرف ایک ہی تعبیر **فصاعداً** کی ہے جس سے معنی مرادی کی تعیین میں غلط فہمی ہوسکتی ہے اور اس کو دور بھی کردیا گیا ہے لیکن قرأت کے سلسلے میں روایات میں صرف **فصاعداً** ہی نہیں ہے بلکہ متابعات وشواہد میں متعدد تعبیرات موجود ہیں، حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں **بفاتحة الکتاب وماتیسر**، حضرت ابوہریرہ کی روایت میں **بقراءة فاتحة الکتاب ومازاد** وغیرہ ہے جن میں **ماتیسر ومازاد** کو واؤ عاطفہ کے ذریعہ فاتحہ کے حکم میں شریک کیا گیا ہے اس لیے یہاں **فصاعداً** کے معنی مرادی کی تعیین میں کسی غلط فہمی کا امکان ہی نہیں اور قرأت کے سلسلے میں یہی معنی معین ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے حکم کو مابعد تک ممتد کردیا گیا اور حنفیہ کے یہاں چونکہ فاتحہ کا حکم وجوب کا ہے اس لیے **فصاعداً** کے مصداق کو بھی واجب قرار دیا جائے گا۔

اس تفصیل کا تقاضہ یہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں تو یہ روایت مقتدی سے متعلق ہی نہیں ہے لیکن شوافع کے یہاں بھی اس کو مقتدی سے متعلق قرار دینا ممکن نہیں کیونکہ ان کے یہاں مقتدی کے لیے صرف قرأتِ فاتحہ کی اہمیت ہے، غیر فاتحہ سے اس کو روک دیا گیا ہے جبکہ روایت کے معیّن شدہ مندرجہ بالا معنی کی رو سے ضم سورت کا بھی وہی حکم ہے جو فاتحہ کا ہے۔

بخاری کی مختصر روایت میں ضم سورت کا قرینہ

فصاعداً کے اضافہ کے بعد حضرت عبادہؓ کی روایت کے جو معنی متعین ہوتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو بخاری میں ذکر کردہ مختصر روایت **لاصلوة لمن لم یقرء بفاتحة الکتاب** کے **فصاعداً** کے بغیر بھی وہی معنی ہیں۔ یعنی قواعد عربی کی رو سے صرف **بفاتحة الکتاب** کا بھی وہی مفہوم نکلتا ہے جو **فصاعداً مازاد** وغیرہ میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

حضرت علامہ کشمیری قدس سرہٗ نے فصل الخطاب میں لکھا ہے کہ علامہ ابن قیمؒ نے بدائع الفوائد (جلد۲، ص۷۶) میں ایک فصل میں یہ بحث کی ہے کہ **قرأت سورة کذا** اور

قــرأت بســورۃ کــذا میں ذہانت وفطانت رکھنے والوں کے لیے بڑا فرق ہے قــرأت سـورۃ کـذا کا مطلب یہ ہے کہ صرف وہی معین سورت پڑھی جس کا نام لیا گیا ہے، اس کے ساتھ اور کوئی سورت نہیں پڑھی اور قــرأت بســورۃ کـذا کا مطلب یہ ہے کہ میری قرأت میں یہ سورت بھی شامل ہے یعنی تنہا اس سورت کی قرأت نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ اور قرأت بھی کی ہے۔

پھر ابن قیم نے اس دعویٰ پر حدیث پاک سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں جن سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، پہلے استعمال قرأت سورۃ کذا سے متعلق تین مثالیں ذکر کی ہیں، حضرت ابی بن کعب سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان اللـه امرنی ان اقــرأ علیک لم یکن الذین کفروا (مشکوٰۃ، ص۱۹۰) خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ (اے! اُبی) میں تمھیں لـم یکن الذین الخ پڑھ کر سناؤں، دیکھیے یہاں أقرء کا استعمال ''با'' کے بغیر ہے، کیونکہ یہ نماز میں قرأت کا واقعہ نہیں ہے نماز سے خارج کا ہے اور اس میں صرف لم یکن الخ کی قرأت ہے، اس کے ساتھ کسی اور سورت کی قرأت نہیں ہے۔

اسی طرح حضرت جابر کی ایک روایت میں ہے لقد قرأتها (سورۃ الرحمٰن) علی الـجـن (مشکوٰۃ، ص۸۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے سورۂ رحمٰن، جنات کو پڑھ کر سنائی، یہاں پر قـر اتهـفرمایا ہے قـرات بهـا نہیں فرمایا، کیونکہ یہ بھی نماز کا واقعہ نہیں ہے، خارجِ صلوٰۃ میں صرف سورۂ رحمٰن کسی اور سورت کو ملائے بغیر پڑھ کر سنائی گئی ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت میں ہے قـرأ والـنـجـم فـسـجـد فیهـا وسجد من کان معه (مشکوٰۃ، ص۹۴) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ والنجم پڑھی اور آیت سجدہ پر آپ نے بھی سجدہ کیا، یہاں بھی قرء والنجم فرمایا ہے بالنجم نہیں فرمایا ہے کیونکہ یہ بھی خارجِ صلوٰۃ کا قصہ ہے اور صرف سورۂ نجم پڑھی گئی ہے، اس کے ساتھ کوئی اور سورۃ شامل نہیں ہے۔

دوسرے استعمال قـرأت بسـورۃ کذا کی بھی تین مثالیں دی ہیں، حضرت ابو برزہ کی روایت میں ہے کـان یـقـرء بالستین الی المائة (مشکوٰۃ، ص۶۰) فجر کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساٹھ آیتوں سے لے کر سو آیات تک پڑھتے تھے، ابو برزہ چونکہ نماز

فجر میں کی جانے والی تلاوت کی مقدار بیان کر رہے ہیں اس لیے بالستین الی المائة فرما رہے ہیں، مطلب یہ ہے کہ صرف ساٹھ آیات نہیں ہیں بلکہ سورۂ فاتحہ بھی ہے، گویا منجملہ تلاوت یہ ساٹھ آیات بھی ہیں۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے قرء بسورۃ الاعراف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سورۂ اعراف پڑھی، نماز کا واقعہ ہے اس لیے بالاعراف کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ میں سورۂ فاتحہ بھی ہے۔

اسی طرح حضرت جابر بن سمرہ کی روایت میں ہے کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرء فی الفجر بق و القرآن المجید ونحوھا (مشکوۃ،ص۷۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں ق و القرآن المجید یا اس کے بقدر پڑھتے تھے، یہ بھی نماز کا واقعہ ہے اس لیے "بق" فرمایا کہ یہ تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ سورۂ فاتحہ بھی پڑھی گئی ہے۔

نیز یہ کہ انھیں تین مثالوں پر انحصار نہیں ہے. ذخیرۂ احادیث بالعموم جہاں نماز میں کسی سورت کے پڑھنے کا ذکر ہے وہاں باء کا استعمال ہے یقرء فی الظہر باللیل، یقرء فی المغرب بالطور، یقرء فی المغرب بالمرسلات، وغیرہ، اور جہاں خارج صلوۃ میں قرآن کی کسی سورت کو پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے وہاں باء کا استعمال نہیں ہے، آپ نے فرمایا من قرء حم الدخان فی لیلۃ اصبح یستغفر لہ سبعون الف ملک. (مشکوۃ،ص۱۸۷) حضرت نوفل بن معاویہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے پڑھنے کے لیے کچھ بتا دیجیے تو فرمایا اقرأ قل یا ایھا الکافرون فانھا براءۃ من الشرک، حضرت مکحول سے روایت ہے، من قرء سورۃ ال عمران یوم الجمعۃ صلت علیہ الملائکۃ (مشکوۃ،ص۱۸۹) غرض یہ ہے کہ حدیث پاک میں قرأ کو خارج صلوۃ میں قرأت کے معنی میں باء کے بغیر، اور نماز میں باء کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

اس کی وجہ حضرت علامہ کشمیریؒ نے یہ بیان فرمائی کہ لغت عربی میں قرء فعل متعدی ہے جیسے کہ قرء الکتاب، "شے مقروء" پر باء کی ضرورت نہیں، شریعت میں خارج صلوۃ میں قرء کا استعمال اسی وضع لغوی کے مطابق ہے، لیکن نماز میں قرأت ایک رکن ہے اور

عرف شریعت میں اس کے لیے بھی اسی لفظ قرأت کو اختیار کیا گیا ہے، عرف شرعی میں نقل ہونے کے ساتھ یہ لفظ متعدی نہ رہا، لازم ہوگیا اور قرءَ کے معنی ہوگئے فعل فعل القراءة کہ نمازی نے قرأت کا فعل انجام دیا اس صورت میں قَـرءَ کو مفعول بہ کی ضرورت نہیں، لیکن جب فعل قرأت کا کسی سورت سے تعلق بیان کرنا مقصود ہو تو اس کو باء کے ذریعہ متعدی کیا جاتا ہے اور اس وضع شرعی میں ایک معہودیت کی شان بھی پائی جاتی ہے اس لیے قـرءَ بسورة كذا کے معنی عرف شرعی کے مطابق یہ نہیں ہیں کہ اس نے فلاں سورت پڑھی بلکہ اس کے معنی ہیں قَرءَ قراءة معهودة في الشرع بهذه السورة، یا اوقع فعل القراءة المعهودة عند الشرع بهذه السورة، یعنی قرأت کے سلسلے میں نمازی نے وہ کام کیا جو شریعت میں مقرر ہے اور جو چیز شریعت میں مقرر ہے وہ صرف فاتحہ یا صرف سورت نہیں ہے، معہود قرأت یہ ہے کہ امام فاتحہ بھی پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ سورت بھی ملاتا ہے۔

اب اس وضاحت کے بعد امام بخاری کی پیش کردہ مختصر روایت کو سمجھئے، الفاظ ہیں لاصلوة لمن لم يقرء بفاتحة الكتاب، ابن قیم اس کا ترجمہ ومطلب یوں بیان کرتے ہیں معناه: لاصلوة لمن لم يات بهذه السورة في قراءته او في صلاته اى في جملة مايقرء به. وهذا لايقتضي الاقتصار عليها بل يشعر بقراءة غيرها معها. (بدائع الفوائد جلد۲، ص۷۶) یعنی روایت کے الفاظ کا پورا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ جس نے فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی بلکہ اب ترجمہ یہ ہے کہ جس نے قرأت معہودہ میں سورۂ فاتحہ کو شامل نہیں کیا اس کی نماز نہیں ہوئی، ابن قیم فرماتے ہیں کہ اس تعبیر کا تقاضہ سورۂ فاتحہ میں قرأت کا انحصار نہیں، بلکہ اس تعبیر کا تقاضہ یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ، سورۂ فاتحہ کے علاوہ کی بھی قرأت کی گئی ہے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ اگر روایت میں بفاتحة الكتاب کے ساتھ "فصاعداً" یا "مازاد" وغیرہ کچھ بھی نہ ہو تب بھی مطلب وہی نکلتا ہے جو مازاد او فصاعداً وغیرہ کے اضافہ کے بعد صراحت کے ساتھ مذکور ہے اور جب یہ چیز ثابت ہوگئی تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حضرت عبادہ کی روایت کا تعلق مقتدی سے نہیں، امام ومنفرد سے ہے۔

(۳) رواۃِ حدیث کا سمجھا ہوا مطلب

حضرت عبادہ کی روایت پر مختلف زاویوں سے بحث کے نتیجہ میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت کا مقتدی سے کوئی تعلق نہیں اور یہ کہ اس سے مقتدی پر فاتحہ کا وجوب ثابت نہیں ہوتا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ روایت کرنے والے بیشتر راوی حد یہ کہ خود حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بھی وجوب کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔

یہ روایت دراصل زھری عن محمود بن الربیع عن عبادہ کی سند سے آرہی ہے، زہری کے بعد اس کی سندیں متعدد ہوگئی ہیں، امام بخاری، امام مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ میں زہری سے نقل کرنے والے سفیان بن عیینہ ہیں، اس لیے وجوب فاتحہ اور قرأت خلف الامام کے سلسلے میں ان چاروں راویوں کے مسلک کو معلوم کرنے سے مسئلہ منقح ہوجائے گا، کیونکہ محدثین کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ راوی الحدیث اعرف بمراد الحدیث من غیرہ اور محدثین اس اصول کے مطابق راوی کی بیان کردہ مراد کو مقدم قرار دیتے ہیں۔

سفیان بن عیینہ کا مسلک ابوداؤد میں مذکور ہے، ابوداؤد نے پہلے مذکورہ بالا سند سے لاصلوۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب فصاعداً کو ذکر کیا پھر فرمایا قال سفیان لمن یصلّی وحدہ' (ابوداؤد جلد ۱، ص ۱۱۹) حضرت عبادہؓ کی اس روایت کا تعلق منفرد کی نماز سے ہے، یعنی مقتدی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

سفیان بن عیینہ کے شیخ امام زہری ہیں، ان کا مسلک بھی اس سلسلے میں مشہور ہے کہ وہ جہری نماز میں امام کے پیچھے کسی طرح کی قرأت کے قائل نہیں، اور سری نماز میں بھی وجوب کے نہیں صرف استحباب کے قائل معلوم ہوتے ہیں، شرح مقنع کے حوالہ سے عدم وجوب کے قائلین میں متعدد صحابہ وتابعین اور فقہاء ومحدثین کے نام آچکے ہیں ان میں امام زہری بھی شامل ہیں، مزید وضاحت کے لیے تفسیر ابن جریر کی عبارت دیکھئے۔

ابن جریر اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

حدثنا المثنی ناسوید انا ابن المبارک عن یونس عن الزھری. قال

لاقرؤن وراء الامام فیما یجهر به من القراء ة تکفیهم قراء ة الامام وان لم یسمع صوته ولکنهم یقرؤن فیما لم یجهر به سراً فی انفسهم ولایصلح لاحد خلفه ان یقرء معه فیما یجهر به سراً ولا علانیة قال الله تعالیٰ واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

"زہری نے کہا کہ مقتدی، جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہیں کریں گے، امام کی قرأت کافی ہے، خواہ امام کی آواز مسموع نہ ہو، لیکن وہ سری نمازوں میں دل ہی دل میں سری قرأت کریں گے، اور کسی کے لیے امام کے پیچھے جہری نماز میں سرّاً یا علانیۃً قرأت کرنا درست نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، **واذا قری القرآن فاستمعوا. الآیہ**"

امام زہری کے شیخ محمود بن الربیع ہیں، یہ حضرت عبادہؓ کے داماد تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر پانچ سال تھی، صغارِ صحابہ میں ان کا شمار ہے ان کا مسلک سمجھنے کے لیے بیہقی کی اس روایت پر غور کیجیے۔

عن محمود بن الربیع قال سمعت عبادة بن الصامت یقرء خلف الامام فقلت له تقرء خلف الامام؟ فقال عبادة لاصلوٰة الابقراء ة

(السنن الکبری، جلد ۲، ص ۱۶۸)

محمود بن الربیع سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبادہؓ کو سنا، وہ امام کے پیچھے قرأت کر رہے تھے، تو میں نے کہا، آپ امام کے پیچھے قرأت کر رہے ہیں؟ تو حضرت عبادہؓ نے فرمایا کہ قرأت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

محمودؓ بن الربیع نے حضرت عبادہؓ کو قرأت خلف الامام کرتے دیکھا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بات صحابہ کے درمیان رائج نہ تھی اور ان کا عمل بھی بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے کا نہیں تھا، اسی لیے انھوں نے حضرت عبادہؓ سے عرض کر دیا کہ آپ یہ عمل کیوں کر رہے ہیں؟ حضرت عبادہ نے جواب دے دیا کہ میرا مسلک تو یہی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرتا ہوں نماز قرأت کے بغیر نہیں ہوتی۔ اس سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ محمود بن الربیع مقتدی کے لیے قرأت یا وجوب فاتحہ کے قائل نہیں تھے۔

اب آخر میں حضرت عبادہؓ کے مسلک کا ذکر باقی ہے، تو اسی روایت سے حضرت عبادہؓ

کا مسلک معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ اگرچہ قرأت خلف الامام کے قائل ہیں مگر ظاہر یہی ہے کہ وجوب کے قائل نہیں ہیں۔

غور کیجیے کہ حضرت عبادہؓ، امتیازی اوصاف کے حامل صحابۂ کرام میں ہیں، حضرت معاویہؓ سے ایک مسئلہ میں اختلاف رائے پر ناراض ہوئے تو یہ کہہ کر مدینہ واپس آگئے کہ تمھارے زیرِ امارت تو رہنے کی بھی گنجائش نہیں، پھر حضرت عمرؓ نے انھیں یہ کہہ کر واپس کیا کہ آپ کو وہاں جانا چاہیے البتہ آپ حضرت معاویہؓ کی امارت سے مستثنیٰ رہیں گے۔ یہ واقعہ ابن ماجہ میں ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ امیر معاویہؓ سے اختلاف رائے میں تو تصلب کا یہ مظاہرہ ہو، اور اپنے گھر کے فرد اور داماد حضرت محمود بن الربیع سے نماز جیسی اہم عبادت کے مسئلے میں اختلاف رائے ہو تو محض اپنی رائے کے اظہار پر اکتفاء کریں اور انھیں کوئی نصیحت نہ فرمائیں۔

حضرت عبادہؓ اگر وجوبِ فاتحہ کے قائل ہوتے تو مزاج کے تصلب، ورع وتقویٰ کے امتیازی وصف کی بنیاد پر ضروری تھا کہ وہ محمود بن ربیع کو تفصیل سے سمجھاتے کہ تم مجھ سے قرأت خلف الامام کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟ تم کیسے نماز پڑھتے ہو؟ اور اس کی ضرورت یوں اور بڑھ جاتی ہے کہ محمود ان کے قریبی عزیز اور شاگرد ہیں۔ اگر حضرت عبادہؓ جیسے خاندان کے بزرگ اپنے خوردوں کو نماز کی صحت وفساد پر متنبہ نہ فرمائیں گے تو یہ کام کون کرے گا؟

اس لیے حضرت عبادہ کے بارے میں یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ وہ اگرچہ قرأت خلف الامام کے قائل ہیں اور یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ وہ اس عمل کو پابندی سے کرتے بھی ہیں لیکن ظاہر یہی ہے کہ وہ وجوب کے قائل نہیں ہیں ورنہ اس مسئلے میں ان کا انداز یہ نہ ہوتا کہ وہ محض اپنی رائے بیان کردیں اور اس کے خلاف نکیر نہ فرمائیں۔

روایت عبادہؓ پر مباحث کا خلاصہ

امام بخاری نے باب کے تحت تین روایات ذکر فرمائی تھیں جن میں مقتدی پر وجوبِ

فاتحہ کے لیے حضرت عبادہؓ کی روایت سے استدلال ممکن تھا، اس لیے اس روایت پر قدرے تفصیلی کلام کیا گیا اور مختصر روایت کو مفصل روایت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی، متابعات و شواہد کے ساتھ سمجھنے کی بھی کوشش کی، فصاعدا کے اضافہ کے بعد مضمون سمجھنے کی کوشش کی، قواعد عربیت کے مطابق مضمون مستنبط کرنے کی کوشش کی اور ہر موضوع پر اٹھائے جانے والے اہم اشکالات کا جائزہ لیا، لیکن ہر اعتبار سے یہی بات محقق ہوئی کہ روایت کو مقتدی کے لیے وجوب فاتحہ سے متعلق قرار دینا صحیح نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ روایت کرنے والے راوی بھی اس کے عموم میں مقتدی کو شامل نہیں سمجھتے۔

اور یہ کہ اب تک جو گفتگو کی گئی وہ سب حضرت عبادہؓ کی روایت کے اندر پائے جانے اے مضامین اور اس کے داخلی قرائن سے متعلق تھی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند خارجی لائل و قرائن کو سامنے رکھ کر بھی غور کرلیا جائے کہ حضرت عبادہؓ کی روایت کے عموم میں قتدی کو شامل کیا جاسکتا ہے، یا نہیں؟

(۴) مقتدی کی قرأت اور قرآن کریم

ان خارجی دلائل میں ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ اہمیت قرآن کریم کو حاصل ہے، حضرت معاذ کی وہ روایت یاد کیجیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انھیں یمن بھیجا تو فرمایا، معاذ! کوئی بات پیش آ گئی تو کیسے فیصلہ کروگے؟ حضرت معاذؓ نے جواب میں عرض کیا کہ کتاب اللہ کے ذریعہ فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ ملا تو کیا کروگے؟ عرض کیا کہ سنت رسول اللہ کے ذریعہ فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا، اس میں نہ ملا تو کیا کروگے؟ عرض کیا، اجتهد رائی ولا آلو، اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور کوئی کوتاہی نہ کروں گا، آپ نے حضرت معاذؓ کے جواب کی تحسین فرمائی، اسی اصول کے مطابق خارجی دلائل میں سب سے پہلے قرآن کریم کو دیکھنا چاہیے، باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔ (سورۃ الاعراف آیت ۲۰۴)

اور جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنا کرو، اور خاموش رہا کرو۔

یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور خواہ لیلۃ المعراج میں نماز کی فرضیت سے پہلے

اس کا نزول ہو یا بعد میں، اور خواہ حضرت عبادہؓ کی روایت اس سے پہلے کی ہو یا بعد کی، لیکن جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول نماز ہی ہے، مشہور صحابۂ کرام میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ یہی فرماتے ہیں، تابعین میں مجاہد، حسن بصری، سعید بن المسیب وغیرہ سے یہی منقول ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول نماز ہے اور امام احمد نے تو اس بات پر تمام اہل علم کا اتفاق اور اجماع نقل کیا ہے۔ نیز جمہور مفسرین اس آیت کا شانِ نزول نماز کو قرار دے رہے ہیں۔

گویا آیتِ قرآن کا موضوع ہی قرأتِ خلف الامام ہے اور اس میں صاف طور پر حکم دیا جارہا ہے کہ جب امام قرأت کرے تو مقتدی پر استماع اور انصات لازم ہے، ''استماع'' کے معنی ہیں کان جھکا دینا جس کا حاصل توجہ ہے، مطلب یہ ہے کہ جب امام قرأت کرے تو آواز آئے یا نہ آئے تمھیں ہمہ تن گوش بن جانا چاہیے، اور ''انصات'' کے معنی ہیں پوری توجہ کر کے خاموشی اختیار کر لینا، سکوت کرنا اور ظاہر ہے کہ سکوت کلام کی ضد ہے، مطلب یہ ہوا کہ نماز جہری ہو یا سری امام کی قرأت کے وقت مقتدی کے لیے اپنی زبان کو حرکت دینا جائز نہیں۔

یا بات کو اس طرح سمجھ لیجیے کہ اذا قری القرآن جہری اور سری دونوں طرح کی نمازوں کو شامل ہے، اور اس پر مرتب کر کے دو حکم۔ استماع اور انصات، بیان کیے گئے ہیں، اس لیے مطلب یہ ہوگا کہ امام جہر کرے تو یہ استماع کا موقع ہے استماع واجب رہے گا اور اگر سری نماز ہو تو اذا قری القرآن کا عمل تو پایا جارہا ہے اور استماع کی صورت ممکن نہیں ہے، اس لیے انصات واجب ہو جائے گا یعنی نماز سری ہو یا جہری، مقتدی کو قرأت کی اجازت نہیں ہے۔

اگر بالفرض شانِ نزول کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے بلکہ آیت کو نماز اور غیر نماز سب کے لیے عام رکھا جائے کہ جہاں بھی قرآن پڑھا جائے تو سننے والے کو ہمہ تن گوش اور خاموش ہو جانا چاہیے تو ہمیں اصول کے مطابق یہ فائدہ اٹھانے کا حق ہے کہ جب سامعین کو خارج صلوۃ میں استماع وانصات کا حکم دیا جارہا ہے تو داخل صلوٰۃ میں استماع وانصات بدرجۂ اولیٰ ضروری ہوگا، کیونکہ خارجِ صلوۃ میں سننے والے کے استماع وانصات میں صرف ایک ہی چیز ملحوظ ہے یعنی قرأت قرآن، جبکہ داخل صلوۃ میں ایک سے زائد چیزیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

(۱) نماز کی روح ہی قرأت قرآن ہے اور نماز میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اس لیے خارج میں قرأت قرآن کا ادب استماع وانصات ہے تو داخل صلوٰۃ میں اس کو بدرجۂ اولیٰ ثابت مانا جائے گا۔

(۲) نیز یہ کہ نماز باجماعت میں موضوع امامت کا تقاضہ بھی یہی ہے، پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا ہے انما جعل الامام لیؤتم به امام کو امام ہی اقتداء کرنے کے لیے بنایا گیا ہے، اس لیے سامع کے مقتدی ہونے کی صورت میں استماع وانصات کی اہمیت بڑھ جائے گی۔

(۳) اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ صحیح اور حسن کے درجے کی متعدد روایتوں سے یہ مضمون ثابت ہے جیسے اذا قرء فانصتوا، اور جیسے من کان له الامام فقراء ة الامام قراء ة له ان روایات پر گفتگو تو اپنی جگہ پر آئے گی، یہاں صرف یہ ثابت کرنا پیش نظر ہے کہ داخل صلوٰۃ میں قرأت قرآن کے وقت استماع وانصات بدرجۂ اولیٰ ثابت ہے۔ ابن تیمیہؒ نے بھی اس کو درجۂ اولیٰ میں ثابت قرار دیا ہے، فرماتے ہیں۔ لانّ استماع المستمع الی قراء ة الامام الذی یاتم به ویجب علیه متابعته اولی من استماعه الیٰ قراء ة من یقرء خارج الصلوٰة (فتاوی جلد ۲۳، ص ۲۷۰)

حاصل گفتگو یہ ہے کہ آیت اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کا شان نزول ہی قرأتِ خلف الامام ہے اور اگر شانِ نزول سے صرف نظر کرلیں تب بھی اسی آیت سے دلالۃ النص کے طور پر مقتدی کے لیے قرأت کی ممانعت ثابت ہے۔

مقتدی کے لیے قرأت ممکن بھی نہیں

قرآن کریم کی آیت سے یہ ثابت ہوگیا کہ امام جب قرأت کرے تو مقتدی کا استماع وانصات اختیار کرنا ضروری ہے، جہری نمازوں میں تو بات صاف ہے لیکن سری نمازوں میں سب مقتدی جانتے ہیں کہ امام، ثنا کے لیے مختصر سا وقفہ کرکے قرآن پڑھتا ہے، مقتدی کو یقین ہے کہ قرآن پڑھا جارہا ہے، پھر اس کے لیے کیا گنجائش ہے کہ انصات کو چھوڑ کر عمل قرأت کو جاری رکھے، بلکہ سچ پوچھئے تو اس آیت کی روشنی میں مقتدی کے لیے نماز میں بذاتِ خود قرأت کا عمل کرنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں، حافظ ابوعمرو بن

عبدالبر نے التمھید میں یہ سوال قائم کیا ہے اور ابن تیمیہؒ نے بھی اسی طرح کی بات لکھی ہے کہ مقتدی پر قرأت کے وجوب کا حکم لگانے والوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کب قرأت کرے؟ اس لیے کہ اس کی تین ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، امام سے پہلے، یا امام کے ساتھ ساتھ یا پھر امام کے بعد، اور ان تینوں صورتوں میں قوی اشکالات ہیں۔

امام سے پہلے مقتدی کی قرأت کی صورت میں، سب سے پہلا اشکال تو یہ ہے کہ مقتدی کا عمل امام سے مقدم ہوگیا اس کی گنجائش نہیں، دوسرا اشکال یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد جو وقفہ ہے وہ ثنا کے لیے ہے، قرأت کے لیے نہیں، اگر اس سکتہ میں قرأت کا عمل مشروع ہوتا تو صحابہؓ کرام اس کو ضرور نقل کرتے، ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

وایضاً فلو کان الصحابة کلهم یقرؤن الفاتحة خلفه اما فی السکتة الاولی واما فی الثانیة لکان هذا ممّا تتوفر الهمم والدواعی علی نقله۔ (فتاوی جلد ۲۳، ص ۲۷۹)

نیز یہ کہ اگر صحابہؓ کرام سکتہ اولی یا سکتہ ثانیہ میں امام کے پیچھے فاتحہ کی قرأت کرتے تھے تو اس کی نقل کا بہت اہتمام ہونا چاہیے تھا، اس کی نقل کے دواعی بھی بہت تھے۔

پھر اس کے بعد لکھتے ہیں **فکیف ولم ینقل هذا احد عن احد من الصحابة** کہ یہ بات کوئی بھی، کسی بھی صحابی سے نقل نہیں کرتا، پھر کچھ تفصیل کے بعد لکھتے ہیں **فعلم انه بدعة** کہ اس سے معلوم ہوا کہ سکتہ میں قرأت خلف الامام کا عمل بدعت ہے۔

تیسرا اشکال یہ ہے کہ پہلا سکتہ اگر مقتدی کی قرأت کے لیے ہوتا تو اس کو واجب ہونا چاہیے تھا، جبکہ وجوب کا کوئی قائل نہیں اور مالکیہ کے یہاں تو سکتہ ہی نہیں، ان کے یہاں تکبیر تحریمہ کے بعد فوراً قرأت شروع ہوجاتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ امام تکبیر کے فوراً بعد قرأت شروع کردے اور سکتہ نہ کرے تو نماز درست ہے یا نہیں؟

اسی طرح مقتدی اگر امام کے بعد فاتحہ پڑھتا ہے تو وہ بھی اشکال سے خالی نہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت کے بعد جو سکتہ ہے وہ بہت مختصر ہے اور آمین کے لیے ہے سورۂ فاتحہ کی قرأت کی اس میں گنجائش نہیں، اور دوسری بات جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے لکھا یہ ہے کہ اس کو دواعی کے باوجود کوئی صحابی نقل نہیں کررہا ہے، پھر کیسے اس کو تسلیم کرلیا جائے،

اور تیسری چیز یہ ہے کہ اگر امام، مقتدیوں کی رعایت سے رُک کر کھڑا ہوجاتا ہے تو گویا امام مقتدیوں کے تابع ہوا اور یہ منصب امامت کے منافی ہے۔

اب ایک ہی صورت باقی رہی کہ مقتدی امام کے ساتھ ساتھ پڑھے، اس صورت میں دو بڑی اہم خرابیاں ہیں ایک خرابی یہ کہ اس میں امام سے منازعت پائی جاتی ہے، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن مالک ابن بحینہ کی روایت میں پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد مالی انازع القرآن موجود ہے، اور دوسری خرابی یہ ہے کہ اس صورت میں فاستمعوا له وانصتوا کی خلاف ورزی ہے منازعت بہ نص حدیث ممنوع ہے اور استماع کی خلاف ورزی بہ نص قرآن ممنوع ہے، پھر ساتھ پڑھنے کی کیسے اجازت دی جائے؟

خلاصہ یہ ہوا کہ مقتدی کی قرأت کے لیے تین ہی صورتیں ممکن تھیں اور تینوں ہی میں قوی اشکالات ہیں اس لیے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ نماز جہری ہو یا سری، امام کے پیچھے قرأت کا عمل قرآن کریم کی اس آیت کی رو سے درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مکحولؒ کے فیصلے پر حیرت

اس لیے اجازت دینے والے اکثر اہلِ علم نے مندرجہ بالا اشکالات کا وزن محسوس کرتے ہوئے بچنے کی کوشش کی ہے، مثلاً کسی نے سکتات کے درمیان قرأت کی اجازت دی، کسی نے سورۂ فاتحہ کے بعد والے سکتہ میں اجازت دی، یہ الگ بات ہے کہ اس سے مسئلہ حل نہیں ہوا کہ ان سکتات میں از روئے احادیث اتنی گنجائش نہیں ہے، لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات حضرت مکحول نے کہی ہے ابوداؤد میں ہے۔ قال مکحول اقرء فیما جھر به الامام اذا قرء بفاتحة الکتاب و سکت سرًّا فان لم یسکت اقرء بھا قبله و معه و بعده لاتترکھا علی حال، پہلے تو یہ فرمایا کہ امام سورۂ فاتحہ کے بعد سکتہ کرے تو فاتحہ سراً پڑھی جائے، پھر فرمایا کہ اگر امام سکتہ نہ کرے تو امام سے پہلے یا امام کے ساتھ یا امام کے بعد بہر صورت پڑھی جائے، حیرت کے سوا اب ہم اس پر کیا عرض کریں، ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے حکم استماع و انصات کے بعد اپنے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے اس طرح کے توسعات پر تبصرے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ بس یہی کہا

جائے گا کہ انھوں نے جو کچھ سمجھ میں آیا بیان فرمادیا!

حافظ ابن حجرؒ کے استدلال پر نقد

اسی طرح حافظ ابن حجر نے گنجائش نکالنے کی بھی کوشش کی ہے۔ باب مایقول بعد التکبیر کے تحت ایک روایت میں آیا تھا اسکاتک بین التکبیر و القراءۃ ماتقول؟ ابوہریرہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ جو تکبیر تحریمہ اور قرأت کے درمیان سکوت فرماتے ہیں تو آپ کیا دعا پڑھتے ہیں؟ حافظ ابن حجرؒ نے یہاں یہ فائدہ اٹھایا کہ سکوت، قرأت کے منافی نہیں ہے، یہ دونوں جمع ہوسکتے ہیں کیونکہ روایت میں اسکاتک بھی آرہا ہے اور ماتقول بھی، پھر ابواب الجمعہ میں انھوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ نمازِ تحیۃ المسجد پڑھنا بھی منافی انصات نہیں ہے، کہتے ہیں فمصلي التحية يجوز ان يطلق عليه انه منصت ۔(فتح جلد۲،ص ۴۷۵) ابن حجر یہ چاہتے ہیں کہ اسکات کو ترکِ جہر کے معنی میں لے کر سری قرأت کا انصات سے تضاد ختم کردیں، اور قرأت خلف الامام کی گنجائش نکال لیں، اور ثابت کردیں کہ مقتدی منصت کے ساتھ قاری بھی ہوسکتا ہے کہ آہستہ آہستہ پڑھتا رہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سکوت بھی فرمارہے ہیں اور قاری بھی ہیں۔

ابن حجر کی یہ بات بہ ظاہر درست معلوم ہوتی ہے، لیکن غور کیجیے کتاب الوحی میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں گذرچکا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب وحی لے کر تشریف لاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہونٹوں کو حرکت میں لاتے، ترمذی شریف میں زیادہ واضح ہے يحرك به لسانه يريد ان يحفظه کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو یاد کرنے کی وجہ سے زبان مبارک اور لب ہائے مبارک کو آہستہ آہستہ ہلاتے تھے یعنی سراً پڑھتے جاتے تھے کہ قرآن یاد ہوجائے، بھول نہ جائیں، آپ کے اس سری قرأت فرمانے پر حکم نازل ہوا، لاتحرك به لسانك الآيه آپ زبان کو بالکل حرکت نہ دیں، قرآن کا آپ کے سینہ میں محفوظ کرنا اور آپ کی زبان سے پڑھوادینا ہماری ذمہ داری ہے، بخاری شریف کی روایت میں اس موقع پر فاتبع قرانه کی تفسیر میں ہے۔

فاستمع له وانصت (بخاری جلد۱،ص۳)

آپ پوری توجہ مبذول کریں اور خاموش رہیں۔

اس روایت سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ زبان کو سرا حرکت دینا یا ہونٹوں کو جنبش میں لانا بھی استماع وانصات کے منافی ہے اور جب حقیقت یہ ہے تو ابن حجر کو غور کرنا چاہیے تھا کہ اسکاتک بین التکبیر والقراء ۃ میں اسکات کو ترک جہر کے معنی میں لینا درست نہیں بلکہ یہ سکوت عن الکلام السابق یا وقفہ کے معنی میں ہے، حضرت علامہ کشمیریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہاں یرید السکوت عما قبلہ وھو التکبیر. مراد یہ ہے کہ کلامِ سابق کے ختم کرنے کو سکوت سے تعبیر کر دیا گیا ہے کہ تکبیر کے بعد جو آپ وقفہ کرتے ہیں اس میں کیا پڑھتے ہیں، یعنی اسکات سے مراد ترک جہر نہیں بلکہ وقفہ ہے، علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اہل عرب، سکوت کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسے قال فلان کذا وسکت علیہ، ای عن ردہ، پھر فرماتے ہیں کہ ابن حجر کی متدل روایت کے بعض طرق میں اس معنی میں استعمال کی صراحت ہے، امام بخاری نے جزء القراءۃ میں باب من قرء فی سکتات الامام میں یہ الفاظ ذکر کئے ہیں، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یسکت اسکاتۃ عن تکبیرۃ الخ کیا اس سے یہ بات بالکل صاف نہیں ہوتی کہ یہاں لفظ اسکات، تکبیر کے بعد وقفہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ ابن حجر جس روایت سے استدلال کر رہے ہیں اس میں لفظ اسکات ہے اور اس موضوع پر نص قرآن یا نص حدیث میں لفظ انصات استعمال ہوا ہے اور ان دونوں الفاظ میں فرق ہے، اسکات کے معنی ہیں خاموشی بمعنی ترک تکلم، اور انصات کے معنی ہیں اسکت سکوت مستمع، پوری توجہ مبذول کرنے والے کی طرح سکوت اختیار کرنا، یعنی آواز آ رہی ہے تو ہمہ تن گوش ہو جاؤ اور آواز نہیں آ رہی ہے تو بغور سننے والوں کی طرح خاموش رہو، پھر جب از روئے لغت دونوں میں فرق ہے اور قرینۂ مقام سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اسکات بمعنی وقفہ ہے تو ابن حجر کے اس دعوے کو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ انصات اور قرأت میں منافات نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ آیت قرآنی اذا قرئ القرآن فاستمعو الہ وانصتوا اسی طرح نص حدیث اذا قرء فانصتوا میں انصات کا مقابلہ قرأتِ قرآن سے کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ قرأتِ قرآن کے وقت انصات اختیار کرو جبکہ ابن حجر کی متدل

روایت اسکاتک بین التکبیر میں یہ تقابل نہیں ہے بلکہ تکبیر اور قرأت کے درمیان پائی جانے والی حالت پر اسکات کا لفظ بولا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ حالت وقفہ کی ہے، اس تفصیل سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حافظ ابن حجر کا یا کسی اور کا اسکاتک الخ سے سری قرأت کی گنجائش نکالنا درست نہیں ہو سکتا، اور قرآن کریم کے حکم انصات کی جہاں جہری قرأت سے منافات ہے، وہاں سری قرأت سے بھی ہے۔

بہرحال قرآن کریم کی آیت سے، یہ حکم صراحت وقوت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی کا وظیفہ نماز میں قرأت نہیں، استماع وانصات ہے اور جب یہ بات ہے تو حضرت عبادہؓ کی روایت کے عموم میں مقتدی کو داخل کرنا درست نہیں۔

(۵) مقتدی کی قرأت اور احادیث

حضرت معاذؓ کی روایت کے مطابق غور طلب اور اختلافی مسائل میں فیصلہ کا دوسرا ذریعہ حدیث پاک ہے، اس لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ قرأت خلف الامام کے موضوع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا ارشاد فرمایا ہے تاکہ حضرت عبادہؓ کی روایت میں کہے جانے والے عموم کے دعوے کا وزن معلوم کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ حدیث پاک کے پورے ذخیرے میں ایک بھی صحیح روایت ایسی نہیں ہے جس میں صراحت کے ساتھ مقتدی کو قرأت کا حکم دیا گیا ہو، جب کہ متعدد صحابۂ کرام سے کثیر تعداد میں صحیح اور حسن سند کے ساتھ ایسی روایات موجود ہیں جن میں صراحت کے ساتھ مقتدی کو انصات کا حکم دیا گیا ہے یا امام کی قرأت کو مقتدی کے لیے کافی قرار دیا گیا ہے یا مقتدی کی قرأت پر اظہار ناگواری کے بعد صحابۂ کرام کے قرأت کو ترک دینے کا ذکر ہے، وغیرہ، ان تمام روایات کے استیعاب کا تو یہاں موقع نہیں، مگر چند روایات پیش کی جاسکتی ہیں۔

مقتدی کے لیے حکم انصات پر مشتمل روایت

مثلاً ایک صحیح روایت میں صراحت کے ساتھ مقتدی کو انصات کا حکم دیا گیا ہے، جس

کے الفاظ یہ ہیں۔

اذا قرأ فانصتوا (مسلم جلد ا ص ۱۷۴)

جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس موقع پر پہلے ابوموسیٰ اشعریؓ کی ایک طویل حدیث ذکر فرمائی ہے۔ پھر اس کی متعدد سندیں ذکر کی ہیں اور حدثنا اسحق بن ابراهیم قال انا جریر عن سلیمان التیمی عن قتادة عن یونس بن جبیر عن حطان بن عبد الله عن ابی موسی الاشعری کی سند ذکر کر کے فرمایا کہ اس میں اذا قرأ فانصتوا کا اضافہ ہے، اس اضافہ کو اگر اس حدیث طویل کے نماز سے متعلق حصہ کے ساتھ ملایا جائے تو روایت کے الفاظ اس طرح ہو جاتے ہیں۔

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم خطبنا فبیّن لنا سُنّتنا وعلمنا صلوتنا فقال اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمّکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیهم ولا الضالین فقولوا آمین۔ (مسلم جلد ا ص ۱۷۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے خطبہ دیا اور ہمارے سامنے سنت کا بیان فرمایا اور ہمیں نماز کی تعلیم دی اور فرمایا کہ جب نماز کا ارادہ کرو تو پہلے اپنی صفیں درست کرلو پھر چاہیے کہ تم میں سے ایک امام بنے اور جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیهم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

پھر اس کے بعد امام مسلم کے راوی ابواسحاق کہتے ہیں کہ ابوبکر ابن اخت ابی النضر نے حضرت ابوموسیٰ کی اس اضافہ والی روایت کے بارے میں کچھ کہا تو قال مسلم ترید احفظ من سلیمان؟ یعنی کیا تمھیں سلیمان سے اونچے حافظ حدیث کی تلاش ہے؟ مطلب یہ تھا کہ سلیمان حفظ وضبط میں کمال رکھنے والے شیخ ومحدث ہیں۔ اس لیے کسی کی مخالفت ان کے لیے مضر نہیں۔

اس کے بعد ابوبکر نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے بارے میں پوچھا تو امام مسلم

نے فرمایا کہ میرے نزدیک وہ صحیح ہے، اس پر ابوبکر نے یہ پوچھا کہ پھر آپ نے اس کو کتاب میں کیوں ذکر نہیں کیا؟ تو امام مسلمؒ نے جواب دیا۔ لیس کل شئی عندی صحیح وضعته ھٰھنا انما وضعت ھٰھنا مااجمعوا علیه میرے نزدیک جتنی احادیث صحیح ہیں ان سب کو میں نے اس کتاب میں نہیں لیا ہے، صرف ان روایات کو لیا ہے جن کی صحت پر محدثین حضرات کا اجماع ہے۔

گویا امام مسلم کے پیش نظر یہاں اذا قرأ فانصتوا کے اضافہ والی دو روایتیں ہیں، ایک روایت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی ہے جسے اہمیت کے ساتھ انھوں نے متن کتاب میں لیا ہے اور اس پر کئے گئے اشکال کا جواب اتــریــد احفظ من سلیمان (کہہ کر دیا ہے اور یہ روایت امام مسلم کے نزدیک ما اجمعوا علیه کا مصداق ہے اور دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ کی ہے جسے انھوں نے صحیح میں نہیں لیا تھا لیکن ابوبکر بن اخت ابی النضر کے جواب میں انھوں نے اس روایت کو بھی اپنے نزدیک صحیح قرار دیا اور اس طرح یہ روایت بھی امام مسلم کی خصوصی تصحیح کے ساتھ کتاب مسلم میں اشارۃ ذکر میں آگئی۔

امام مسلم کے ما اجمعوا کا مطلب

امام مسلم کے نزدیک ما اجمعوا کے کیا معنی ہیں؟ تو بعض اکابر نے تو یہ لکھا ہے کہ اس سے چند ائمہ محدثین مراد ہوتے ہیں، جن میں امام احمد، یحییٰ بن معین، عثمان بن ابی شیبہ اور سعید بن منصور خراسانی شامل ہیں، لیکن مقدمہ ابن الصلاح میں اس کے معانی کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

قلت اراد. واللہ اعلم، انه لم یضع فی کتابه الا الاحادیث التی وجد عنده فیها شرائط الصحیح المجمع علیه وان لم یظهر اجتماعهافی بعضها عند بعضهم (مقدمہ ابن الصلاح ص ۸)

میں کہتا ہوں کہ ما اجمعوا کی مراد۔ واللہ اعلم یہ ہے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں صرف ان احادیث کو جگہ دی ہے جن میں ان کے نزدیک محدثین کی مقرر کردہ حدیث صحیح کی اجماعی شرائط پائی جاتی ہیں خواہ ان تمام شرائط کا بعض روایات میں بعض محدثین کے نزدیک

پایا جانا ظاہر نہ ہوا ہو۔

مـا اجمعوا علیه کی یہی تشریح بہتر معلوم ہوتی ہے کہ امام مسلم یقیناً محدثین کی مقرر کردہ اجماعی شرائطِ صحت سے واقف ہیں اور وہ ان شرائط کو جن روایات میں محقق پاتے ہیں ان ہی کو اپنی صحیح میں جگہ دیتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ بعض محدثین کی نظر میں، بعض روایات میں ان شرائط کا تحقق ظاہر نہ ہوا ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت، امام مسلم کی نظر میں محدثین کی مقرر کردہ اجماعی شرائطِ صحت کی حامل ہے، اسی لیے انھوں نے اس روایت کو اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے، البتہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کو انھوں نے صحیح میں اس طرح نہیں لیا اور اس لیے اس کی تصحیح کے وقت انھوں نے هـو عندی صحیح فرمایا کہ وہ روایت میرے نزدیک صحیح ہے گویا وہ اس روایت میں محدثین کی اجماعی شرائطِ صحت کے تحقق کی ذمہ داری نہیں لے رہے ہیں۔

دوسری کتابوں میں ان روایات کی تخریج

صحیح مسلم کے علاوہ یہ دونوں روایات حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آئی ہیں۔

حضرت ابوموسیٰ کی روایت ابوداؤد نے بـاب التشهـد میں ذکر کی ہے مگر اس پر یہ تبصرہ کیا ہے، قـال ابـو داؤد قـولـه وانـصـتـوا ليس بمحفوظ لم يحجي به الاسليمان التيـمـي فـي هذا الحديث، انصتوا کا اضافہ محفوظ نہیں ہے، اس روایت میں سلیمان تیمی کے علاوہ اور کسی راوی نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے۔

نیز یہ روایت ابن ماجہ میں بھی بہ الفاظ اذا قـرء الامـام فانصتوا مذکور ہے، مسند احمد میں بھی ہے صحیح ابوعوانہ میں متعدد صحیح سندوں کے ساتھ ذکر کی گئی، مسند بزار اور بیہقی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہے۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بھی، مسلم شریف کے علاوہ، ابوداؤد میں بـاب الامـام يـصـلـي من قعود میں مذکور ہے مگر اس پر بھی امام ابوداؤد نے یہ تبصرہ کیا ہے قال ابـو داؤد وهـذه الزيادة واذا قرأ فانصتوا ليست بـمحفوظة الوهم عندنا من ابـي خـالد. نیز یہ روایت نسائی شریف اور ابن ماجہ میں بھی ہے، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند

احمد اور دار قطنی وغیرہ میں بھی ہے، اور ان روایات میں سلیمان تیمی، اور ابو خالد الاحمر پر تفرد کے اشکال کا بھی جواب ہے۔

اعتراض اور جوابات

ان روایات پر محدثین کی جانب سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں وہ مطولات میں موجود ہیں ان میں امام ابوداؤد کے تبصرے کو اہمیت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت کے بارے میں انھوں نے کہا کہ انصتوا کا اضافہ محفوظ نہیں کیونکہ یہ سلیمان تیمی کا تفرد ہے، اسی طرح کی بات امام بخاری نے جزء القراءۃ میں اور دار قطنی وبیہقی وغیرہ نے بھی کہی ہے۔

اسی طرح کا اعتراض حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر بھی ہے کہ اس میں ابو خالد الاحمر متفرد ہیں بیہقی نے تو کتاب المعرفۃ میں یہ لکھ دیا کہ حفاظ حدیث ابوداؤد، ابوحاتم، حاکم اور دار قطنی نے اس اضافے کو نادرست قرار دیا ہے، وغیرہ۔ لیکن ان اعتراضات کی اصولِ محدثین کے مطابق کوئی اہمیت نہیں، وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ پہلی روایت میں سلیمان تیمی اور اسی طرح دوسری روایت میں ابو خالد الاحمر ضعیف رواۃ میں نہیں ہیں کہ تفرد کو مضر قرار دیا جائے، بلکہ نہایت ثقہ محدثین ہیں، سلیمان تیمی کے بارے میں امام مسلم نے اترید احفظ من سلیمان فرمایا ہے، ائمۂ جرح وتنقید نے ان کی توثیق کرتے ہوئے اونچے الفاظ استعمال کئے ہیں، امام احمد، امام نسائی، ابن معین اور عجلی نے ان کو ثقہ کہا ہے، ابن حبان نے فرمایا ہے کہ وہ ثقہ، متقن، حافظ صاحب سنت اور بصرہ کے عابدوں میں تھے، ذہبی نے ان کو الحافظ، الامام اور شیخ الاسلام وغیرہ لکھا ہے۔

اسی طرح ابو خالد الاحمر کے بارے میں بڑے وقیع کلمات منقول ہیں، وکیع، ابن معین اور ابن مدینی ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابوحاتم نے ان کو صدوق کہا ہے، عجلی نے ان کو ثقہ، ثبت کہا ہے، ابن ہشام رفاعی نے ان کو ثقہ امین کہا ہے۔ وغیرہ۔ ان کے بارے میں مطولات میں اس سے زیادہ کلمات توثیق ذکر کئے گئے ہیں۔

اس لیے بالفرض اگر یہ حضرات متفرد بھی ہوں تو اس سے روایت کو نا قابل قبول قرار دینا اصولِ محدثین سے انحراف معلوم ہوتا ہے، بلکہ اصول کے مطابق روایت کا قبول کرنا ضروری ہے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ راوی کا تفرد اس وقت مضر ہوتا ہے جب اس کی روایت دیگر ثقہ راویوں سے متعارض ہو، یہاں تعارض محض ظاہر میں تو ہے کہ ایک راوی اذا قرأ فانصتوا کا اضافہ کر رہا ہے اور دوسرے کے یہاں یہ الفاظ نہیں ہیں اور محدثین کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت بھی ہے کہ وہ الفاظ کے ظاہر پر جمود اختیار کر لیتے ہیں لیکن اربابِ تحقیق کے یہاں محض ظاہر پر فیصلہ نہیں کیا جاتا اور مضمون کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے، یہاں یہ صورت ہے کہ اگر بالفرض اذا قرأ فانصتوا سے صرفِ نظر کر لیں تو تب بھی روایت کے سیاق وسباق سے یہی مضمون ثابت ہے۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جن روایات میں اذا قرأ الامام فانصتوا کا اضافہ ہے ان میں امام کی اقتداء اور اتباع کی جزئیات بیان کی گئی ہیں کہ جب امام تکبیر تحریمہ منعقد کرے تو تم بھی تکبیر کہو، جب وہ رکوع میں جائے تم بھی رکوع میں چلے جاؤ، جب وہ سجدہ میں جائے تو تم بھی سجدہ میں جاؤ وغیرہ، اب دیکھنا یہ ہے کہ قرأت کے سلسلے میں امام کی اتباع کا کیا طریقہ بتایا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ کسی روایت میں اذا قرأ فاقرء وا نہیں ہے بلکہ ان روایات میں اگر اذا قرأ فانصتوا سے صرف نظر کر لیں تو یہ بات تو سب ہی روایات میں ہے اذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا امین، بالکل بدیہی بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر مقتدی کو قرأت کی اجازت ہوتی تو الفاظ اذا قلتم غیر المغضوب الخ ہوتے اور سب مقتدیوں سے یہ کہا جاتا کہ جب تم غیر المغضوب الخ پر پہنچو تو آمین کہا کرو بلکہ مسلم شریف کی ایک روایت میں تو اذا قال القاری غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقال من خلفه امین فرمایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قاری صرف امام ہی ہے مقتدی نہیں، اور یہ کہ شریعت نے مقتدی کو امام کے ساتھ قرأت میں شریک ہی نہیں کیا، شرکت ہوئی ہے تو صرف آمین میں ہوئی ہے، نیز یہ کہ اس موضوع پر قرآن کریم کی ہدایت بھی یہی ہے اذا قری القرآن فاستمعوا له

وانصتوا، جس کی تفصیل گذر چکی ہے کہ نزول وحی کے وقت ہونٹوں کو حرکت دینا بھی استماع وانصات کے منافی قرار دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر روایت میں اذا قرأ فانصتوا نہ بھی ہو تب بھی سیاق وسباق سے یہی مضمون معین ہوتا ہے کہ قرأت کے بارے میں مقتدی کے اتباع کا طریقہ انصات ہے قرأت نہیں، اس لیے اضافہ کو تفردِ مضر قرار دے کر رد کرنا کسی بھی حال میں درست نہیں ہے۔

(۳) تیسری بات ہے کہ تفرد کا اعتراض ہی خلافِ واقعہ ہے جن حضرات نے تفرد کا الزام عائد کیا ہے ہمارا حسن ظن تو یہی ہے کہ ان کے علم میں ایسا ہی ہوگا، لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، نہ سلیمان حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت میں متفرد ہیں اور نہ ابوخالد الاحمر حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں۔ کیونکہ صحیح ابوعوانہ میں ابوعبیدہ نے اور دارقطنی میں عمر بن عامر اور سعید بن ابی عروبہ نے قتادہ سے اذا قرء فانصتوا کی روایت میں سلیمان تیمی کی متابعت کی ہے، اسی طرح ابوخالد الاحمر کی متابعت میں محمد بن سعد انصاری اشہلی کا نام نسائی کی روایت میں موجود ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ اصول محدثین کے مطابق متابعت اور شواہد کی بہت اہمیت ہے، ضعیف روایت بھی بسا اوقات ان کے ذریعہ قوت حاصل کر لیتی ہے، پھر اگر صحیح روایت کو درجۂ صحت ہی کی متابعت مل جائے تو اس کی صحت میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ اذا قرأ فانصتوا کے بارے میں صورت حال یہ ہے۔

(الف) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی صحیح روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں جس پر بحث ہو چکی ہے۔

(ب) پہلا شاہد حضرت ابوہریرہؓ کی صحیح روایت ہے اس پر بحث گذر چکی ہے۔

(ج) دوسرا شاہد حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے جو بیہقی کی کتاب القراءۃ میں ثقہ راویوں کی سند سے مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا قرأ الامام فانصتوا (کتاب القراءۃ للبیہقی ص ۹۲)

(د) تیسرا شاہد حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی، کسی ایک شخص نے آپ کے پیچھے سری قرأت کی، نماز سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا کہ کسی نے میرے ساتھ قرأت کی؟ آپ نے یہ بات تین بار کہی

تو ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! میں نے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھی، تو آپ نے ارشاد فرمایا **مالی انازع القرآن، امایکفی قراءۃ امامه؟ انما جعل الامام لیوتم به فاذا قرء فانصتوا۔** (کتاب القراءۃ ص ۹۲)

امام بیہقی نے حضرت انسؓ اور حضرتِ عمرؓ کی روایات کو شاہد کے طور پر ذکر نہیں کیا ہے بلکہ نقل کرنے کے بعد اُن پر جرح کی ہے مگر ہم بیہقی کے ممنون ہیں کہ اس طرح انھوں نے **اذقرأ فانصتوا** کے بارے میں ایسی دو روایتیں ذکر فرما دیں جنھیں شواہد کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

صحیح روایت، اتنے متابعات اور شواہد کے بعد یقیناً شک وشبہ سے بالاتر ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض محدثین، اصولِ محدثین سے ہٹ کر اپنے فقہی مسلک کے زیرِ اثر فیصلہ کریں، یا ان محدثین کے بارے میں حسنِ ظن کی بنیاد پر۔ جیسا کہ ابن الصلاح نے کہا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید ان پر شرائطِ صحت کا انکشاف نہ ہوا ہو، لیکن صورتِ حال کی تنقیح اور شرائطِ صحت کے ظہور وانکشاف کے بعد تو صداقت کو قبول کرلینا چاہیے، **والحق احق ان یتبع**۔ علامہ سندھی نے تو اس موقع پر ایک فیصلہ کن بات ان الفاظ میں ارشاد فرمائی ہے۔ **هذا الحدیث صححه مسلم فلاعبرة تبضعیف من ضعفه**) کہ امام مسلم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، اس لیے تضعیف کرنے والوں کی تضعیف کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

تصحیح اور تضعیف کرنے والوں کے چند نام

تاہم جن لوگوں پر شرائطِ صحت منکشف نہ ہوسکیں اور انھوں نے اس روایت کی صحت کو تسلیم نہیں کیا، ان میں امام بخاری، امام ابوداؤد، دارقطنی، ذہلی اور ابوعلی نیشاپوری وغیر کے نام شمار کئے جاتے ہیں، شاید یہ حضرات بعض رواۃ کے تفرد اور چند معمولی اشکالات کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر گئے۔

اور جن لوگوں نے شرائطِ صحت کے تحقق کی بنیاد پر روایت کو صحیح قرار دیا، ان میں امام احمد بن حنبل امام مسلم، امام نسائی، امام ابوزرعہ رازی، ابوعوانہ، امام منذری، علامہ ابن حزم، امام ابوعمر بن عبدالبر اسحاق بن راہویہ، موفق الدین بن قدامہ، ابن تیمیہ، اور خاتم الحفاظ

حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ ہیں، اور ان میں اکثر مالکی، شافعی اور حنبلی ہیں اور تلاش کرنے سے شاید اور بھی نام مل سکتے ہیں، پھر ان کے ساتھ جماہیر حنفیہ کو بھی شامل کیا جائے تو پھر تصحیح کرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہو جائے گی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اذا قرأ فانصتوا کی روایت بالیقین صحیح ہے اور مقتدی کے بارے میں ہے، جس میں صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ امام کی قرأت کے وقت مقتدی کو انصات کا عمل اختیار کرنا چاہیے، پھر اس تصریح کے بعد کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عبادہؓ کی روایت میں لمن لم یقرء کے عموم میں مقتدی بھی داخل ہے؟

امام کی قرأت کو مقتدی کی قرأت بتانے والی روایت

اس سلسلے کی دوسری روایت جس میں صراحت کے ساتھ مقتدی کو قرأت سے روک دیا گیا ہے، اور امام کی قرأت کو مقتدی کی قرأت بتایا گیا ہے، حضرت جابر بن عبداللہ انصاری اور دیگر متعدد صحابہ سے کتابوں میں آ رہی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

من کان له امام فان قراءته له قراءة. (موطا امام محمد ص ۹۸)

نماز میں جس کا کوئی امام ہو تو امام کی قرأت اس کی قرأت ہے۔

اس روایت میں جو ارشاد فرمایا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ مقتدی کی نماز کو قرأت سے خالی سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ مقتدی کی جانب سے یہ بار امام نے اٹھا رکھا ہے اور مقتدی کو امام کی قرأت کی وجہ سے قاری تسلیم کیا گیا ہے، شریعت میں اس کی نظیریں ہیں کہ ایک چیز متعلق کسی شخص سے ہوتی ہے اور اس کا عمل دوسرے سے کرایا جاتا ہے، جیسے صدقۃ الفطر ہے کہ غلام پر بھی واجب ہے اور چھوٹے بچوں پر بھی لیکن اس وجوب کی ادائگی خود ان کے متعلق نہیں ہے بلکہ غلام کی طرف سے مولیٰ اور بچوں کی طرف سے باپ کو ادا کرنے کا مکلف کیا گیا ہے۔

روایت کس درجہ کی ہے

یہ روایت صحابۂ کرام کی ایک جماعت سے منقول ہے جن میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہم شامل ہیں ہم نے یہ روایت موطا امام محمد سے نقل کی ہے جس کی سند اس طرح ہے اخبرنا ابو حنیفة قال حدثنا ابو الحسن موسیٰ بن ابی عائشة عن عبداللّٰہ بن شداد بن الهاد عن جابر بن عبدالله عن النبی صلی الله علیه وسلم سند کے تمام رجال ثقاہت کے اعلیٰ معیار کے حامل ہیں۔

پہلے راوی امام محمد ہیں جن کے علمی کارناموں کی ساری دنیا میں شہرت ہے، امام شافعی سے ان کے بارے میں یہ منقول ہے حملت عند محمد وقر بعیر کتبا میں نے امام محمد سے اونٹ کے بار کے بقدر کتابوں کا علم حاصل کیا ہے، یہ بھی فرمایا کہ وہ دلوں کو علم سے پُر کردیتے تھے۔ یہ بھی فرمایا اذا تکلم محمد رحمه الله فکانما ینزل الوحی، جب امام محمد علمی گفتگو کرتے تو ایسا معلوم ہونے لگتا کہ وحی کا نزول ہو رہا ہے، امام ذہبی نے فرمایا کہ وہ علم کا سمندر تھے ایک جگہ فرمایا کان من اذکیاء العالم امام احمد سے پوچھا گیا کہ یہ دقیق علمی مسائل آپ نے کہاں سے حاصل کیے؟ تو فرمایا کہ امام محمد کی کتابوں سے، دارقطنی نے فرمایا کہ موطا میں رکوع کے وقت رفع یدین مذکور نہیں لیکن امام مالک سے بیس ''ثقاتِ حفاظ'' نے رفع یدین غیر موطا میں نقل کیا ہے اور ان میں امام محمد اور یحییٰ بن سعید القطان وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے راوی امام اعظم ہیں جن کی علمی جلالت، ورع وتقویٰ، حفظ واتقان اور ذکاوت وفطانت پر شرق وغرب کا اتفاق ہے، علمی فقہی واخلاقی کمالات کا اعتراف اپنی جگہ، البتہ محدثین کے معیار مطلوب کے مطابق سینکڑوں میں سے چند اقوال یہ ہیں، قال شعبة کان واللّٰہ حسن الفهم جید الحفظ (شعبہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ فہم میں بہتر اور حفظ میں عمدہ تھے، شعبہ بن حجاج (التوفی ۱۶۰ھ) امام اعظم کے ہم عصر ہیں، رجال کے سلسلے میں ان کی احتیاط تشدد کی حد تک معروف ہے، انھوں نے قسم کھا کر امام اعظم کے جودتِ حفظ کی شہادت دی، یہ امام اعظم پر ضعفِ حفظ کا الزام عائد کرنے والوں کے لیے عبرت کی چیز ہے، امام اعظم کے بارے میں تقریباً تواتر سے منقول ہے کہ وہ دو رکعتوں میں قرآن کریم ختم کرتے تھے، کیا ایسے لوگوں کو ضعیف الحفظ کہا جا سکتا ہے؟ امام علی بن مدینی جن کا تشدد مشہور ہے اور جو امام بخاری کے اجلہ شیوخ میں ہیں، جن کے بارے میں امام

بخاری کہتے ہیں کہ میں نے ابن مدینی کے علاوہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ نہیں سمجھا، وہ امام صاحب کے بارے میں کہتے ہیں، **هو ثقة، لاباس به**، اس زمانہ میں **لاباس به**، ثقہ کے ہم معنی استعمال ہوتا تھا اور یہی معنی علی بن مدینی کے یہاں بھی ہیں، اسی طرح ابن معین نے امام صاحب کے بارے میں فرمایا **هو ثقة ماسمعت احداً ضعفه**، وہ ثقہ ہیں، میں نے کسی کو انہیں ضعیف کہتے ہوئے نہیں سنا، حضرت علامہ کشمیریؒ ابن معینؒ کے اس قول سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ابن معین کے دور تک امام صاحب کے بارے میں جرح کا ثبوت نہیں تھا، ابن معین کی وفات ۲۳۳ھ میں ہے، بعد میں اگر کسی نے جرح کی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

تیسرے راوی موسیٰ بن ابی عائشہ کوفی ہیں، جو بالاتفاق ثقہ اور ثبت ہیں صحیحین کے رجال میں ہیں، چوتھے راوی عبداللہ بن شداد ہیں جو رویۃً صحابی اور روایۃً تابعی ہیں، ان کا ثقہ ہونا یقینی چیز ہے، ایسا راوی مرسلاً بھی روایت کرے تو اس کا قبول کرنا محدثین کے قول کے مطابق بھی ضروری ہے اور پانچواں نام عظیم المرتبت صحابی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ تمام راوی ثقاہت کے اعلیٰ معیار کو پورا کرتے ہیں، تو روایت پر کلام کرنے کی گنجائش نہیں، اس لیے ابن ہمام نے اس روایت کو **صحیح علیٰ شرط الشیخین** قرار دیا ہے، علامہ عینی نے بھی صحیح کہا ہے۔

امام دارقطنیؒ کی تنقید

اس روایت کو دارقطنیؒ نے بھی کئی سندوں سے نقل کیا ہے اور اس پر یہ تنقید کی ہے **لم یسنده عن موسیٰ عن ابی عائشه غیر ابی حنیفة والحسن بن عمارة، وهما ضعیفان** کہ اس روایت کو موسیٰ بن ابی عائشہ سے، ابو حنیفہ اور حسن بن عمارہ کے علاوہ کسی نے مسند بیان نہیں کیا ہے اور یہ دونوں (حفظ کے اعتبار سے) ضعیف راوی ہیں۔

لیکن دارقطنی کی دونوں باتیں غلط ہیں، نہ امام اعظم کو ضعیف قرار دینا صحیح ہے اور نہ یہ دعوے صحیح ہے کہ امام صاحب اور حسن بن عمارہ کے علاوہ کسی نے اس کو مرفوعاً بیان نہیں کیا جہاں تک امام صاحب کو ضعیف کہنے کی بات ہے تو یہ ایسی مہمل بات ہے جس کا جواب

دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ یہ "بازی بازی بارلیش بابا ہم می بازی" کا مصداق ہے تاہم کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے۔ جیسا کہ چند ائمہ کے اقوال پیش کیے جا چکے ہیں اور اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ محدثین کرام کی جرح وتعدیل اور اس کے ردّ وقبول کے بھی اصول ہیں، ورنہ ہر شخص کی، ہر انسان کے بارے میں جرح کو قبول کیا جائے تو پھر کوئی بڑے سے بڑا محدث بھی نہیں بچے گا، اسی باب میں آپ نے دیکھا کہ کہنے والے نے حضرت سعد بن ابی وقاص تک کے بارے میں یہ کہہ ڈالا کہ وہ نماز پڑھانا بھی نہیں جانتے، تاج الدین سبکی (المتوفی ۷۷۱ھ) نے لکھا ہے **لو اطلقنا تقديم الجرح لماسلم لنا احد من الائمة، اذما من امام الا وقد طعن فيه طاعنون وهلک فيه هالكون**، اگر ہم جرح کو ہر حال میں مقدم کردیں تو ائمہ میں سے کوئی محفوظ نہیں رہے گا، اس لیے کہ ہر امام کے بارے میں طعن کرنے والوں نے طعن کیا ہے، اور ہلاک ہونے والے یہ کام کر کے ہلاک ہو چکے ہیں۔

نیز یہ کہ ائمہ کبار کے بارے میں کسی نے کلام کیا ہے تو اس پر نکیر بھی کی گئی ہے، محمد بن عمرو عقیلی (المتوفی ۳۲۲ھ) نے علی بن مدینی کو ضعفاء میں شمار کیا ہے تو حافظ ذہبی (۷۴۸ھ) نے میزان الاعتدال میں اس طرح لکھا **أفما لک عقل يا عقيلي؟ اتدری فيمن تتكلم وانما اشتهي ان تعرفني من هو الثقة الثبت الذی ماغلط و لاانفرد بما لايتابع عليه.** عقیلی! کیا تمھیں عقل نہیں ہے؟ جانتے ہو کس کے بارے میں کلام کر رہے ہو، میں آپ سے صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایسا ثقہ اور ثبت کون ہے جس سے غلطی نہیں ہوئی؟ اور اس کی روایت میں ایسا انفراد نہیں ہے جس کی متابعت نہیں ملتی؟ اسی طرح دارقطنی کے امام اعظم کو ضعیف کہنے پر علامہ عینی نے لکھا ہے **ومن اين له تضعيف ابی حنيفة وهو مستحق التضعيف وقدروی مسنده احاديث سقيمة و معلولة ومنكرة وموضوعة**، دارقطنی کو امام ابوحنیفہ کی تضعیف کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا؟ وہ خود مستحق تضعیف ہیں، انھوں نے اپنی مسند میں کمزور، معلول، منکر اور موضوع احادیث نقل کی ہیں۔ اسی طرح مولانا عبدالعلی بحرالعلوم نے فواتح الرحموت میں لکھا ہے کہ تزکیہ کا کام کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خود عادل ہو، اسباب جرح وتعدیل

سے واقف ہو، منصف ہو، خیر خواہ ہو، متعصب نہ ہو، خود پسندی کا مریض نہ ہو فانہ **لااعتداد بقول المتعصب کماقدح الدار قطنی فی الامام ابی حنیفة بانه ضعیف فی الحدیث و ای شناعة فوق هذا؟** کہ متعصب کی بات کا کیا اعتبار؟ جیسے دار قطنی نے امام ابوحنیفہ کو ضعیف کہہ دیا، اس سے زیادہ بدتر کیا بات ہوگی؟ پھر کچھ آگے چل کر یہ فرمایا کہ **والحق ان الاقوال التی صدرت عنهم کلها صدرت من التعصب لاتستحق ان یلتفت الیها،** کہ امام اعظم کی شان میں اس طرح کی تمام باتیں تعصب کا نتیجہ ہیں جو کہ کسی حال میں بھی لائق التفات نہیں ہیں۔

اسی طرح دار قطنی کا دوسرا اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کہ اس روایت کو صرف امام اعظم اور حسن بن عمارہ نے مرفوعاً بیان کیا ہے، کیونکہ موسیٰ بن ابی عائشہ سے مرفوعاً بیان کرنے والوں میں سفیان اور شریک بھی ہیں، امام احمد بن منیع (المتوفی ۲۴۴ھ) نے اپنی مسند میں یہ روایت ذکر کی ہے، احمد بن منیع اکابر محدثین میں ہیں، صحاح ستہ کے تمام مصنفین ان کے تلامذہ میں ہیں، علم میں انھیں امام احمد بن حنبل کے ہم پایہ قرار دیا گیا ہے، ان کی کتاب مسند، محدثین کے درمیان متداول بھی رہی ہے، مسند احمد بن منیع کی سند اس طرح ہے **اخبرنا اسحاق الازرق حدثنا سفیان و شریک عن موسیٰ بن ابی عائشة عن عبدالله بن شداد عن جابر قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم.** یہ سند بالکل صحیح ہے بوصیری نے اس کے بارے میں سندہ صحیح کہا ہے، اسحاق ازرق صحیح کے راوی ہیں، باقی تمام رُوات بھی صحیح کے ہیں، سفیانؒ اور شریکؒ، دونوں اس روایت کو موسیٰ بنؒ ابی عائشہ سے مرفوعاً بیان کرنے میں امام اعظمؒ کے ساتھ شریک ہو گئے، تنہا امام اعظم کا طریق نہ رہا یہ سند صحیح مرفوعاً نقل کرنے والوں میں اور بھی نام ہیں۔

افسوس ہے کہ اس کے باوجود حقیقت کو تسلیم کرنے کے بجائے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ روایت مسند نہیں ہے وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن شداد سے مرسلاً آرہی ہے جیسا کہ مصنف بن ابی شیبہ وغیرہ میں ہے، لیکن انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جس طریق میں مرسل ہے اسے مرسل کہو اور جس طریق میں مرفوع ہے اس کو مرفوع تسلیم کرو۔ اور اگر بالفرض مرسل بھی ہے تو مرسل بھی تو حجت ہوتی ہے اور صحابی کا مرسل تو بالاتفاق حجت ہے

اور یہ مرسل تو ایسا ہے کہ توارث کے طور پر ایک بڑی جماعت کا عمل اس کی موافقت میں موجود ہے اور یہ کہ اس کی تائید اتنے طرق سے ہو رہی ہے کہ اس سے قوت بڑھ جاتی ہے۔ محدثین کے اصول میں یہ بھی ہے کہ اگر مرسل کسی دوسرے طریق سے موصولاً مروی ہو تو اس کی طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ قابل استدلال ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت اول تو متعدد صحابہ سے منقول ہے اور ان تمام میں کم از کم حضرت جابرؓ کی روایت تو صحیح اور متصل سندوں کے ساتھ آ رہی ہے اور عبداللہ بن شداد سے مرسل روایت کے صحیح الاسناد ہونے میں تو محدثین کا کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، باقی طرق حسن بھی ہیں اور ضعیف بھی، اس لیے ابن حجر کا تخریج احادیث الرافعی میں اس حدیث کی تمام سندوں کو معلول کہہ دینا صحیح نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نقل ہی کمزور سندیں کی ہیں اور ان پر **کلها معلولة** کا حکم لگا دیا، ورنہ تمام طرق پر معلول کا حکم لگانا بالکل خلاف واقعہ ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ **من کان له الامام** الخ صحیح روایت ہے، اور اس میں صراحت کے ساتھ یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ مقتدی کی نماز کو قرأت سے خالی سمجھنا غلط ہے، مقتدی کو امام کی قرأت کی بنیاد پر شرعاً قاری تسلیم کیا گیا ہے اور خود مقتدی کو قرأت سے روک دیا گیا ہے، پھر اس تصریح کے بعد حضرت عبادہؓ کی روایت میں **لمن لم یقرء** کے عموم میں مقتدی کو کیسے شامل کیا جا سکتا ہے؟

مقتدی کے قرأت کو ترک کر دینے کی روایت

اب اس موضوع پر تیسری روایت بھی پیش ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ قرأت خلف الامام پر اظہار ناراضگی کے بعد، تمام مقتدیوں نے اس عمل کو ترک کر دیا تھا، یہ روایت موطا امام مالک، نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد وغیرہ میں موجود ہے، موطا مالک کے الفاظ یہ ہیں۔

مالک عن ابن شهاب عن ابن اکیمة اللیثی عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ انصرف من صلاة جهر فیها بالقراءة فقال: هل قرأ معی منکم

احد انفا؟ فقال رجل نعم: انا یا رسول اللہ: قال فقال رسول اللہ ﷺ انی اقول: مالی انازع القرآن فانتھی الناس عن القراءۃ فیما جھر فیہ رسول اللہ ﷺ حین سمعوا ذلک من رسول اللہ ﷺ (ص ۲۹)

"امام مالک، ابن شہاب زہری سے اور وہ ابن اکیمہ لیثی سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی نماز سے فارغ ہوئے جس میں آپ نے جہری قرأۃ کی تھی، پھر فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے، تو ایک شخص نے عرض کیا۔ جی ہاں! یارسول اللہ! میں نے کی ہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ مجھے یہ کیا ہوا کہ میرے ساتھ قرآن کی تلاوت میں کشمکش کی جارہی ہے۔ چنانچہ آپ کے اس ارشاد کو سننے کے بعد، لوگوں نے جہری نمازوں میں قرأت کو ترک کردیا۔"

اس روایت سے پہلی نظر میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ نمازوں میں قرأت خلف الامام کا رواج نہیں تھا، کیونکہ آپ کے نکیر فرمانے پر صرف ایک شخص نے اعتراف کیا ہے کہ حضور! یہ کام میں نے کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس ایک شخص کی قرأت بھی جہری نہیں سری ہے، کیونکہ آپ کا سوال ھل قرأ ہے، یعنی سوال یہ ہے کہ کیا کسی نے قرأت کی ہے؟ اگر اس شخص نے جہر کیا ہوتا تو سوال من قرأ یا من جھر ہوتا، کہ قرأت کون کررہا ہے؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ آپ کے انکار کی بنیاد جہر نہیں، بلکہ کشمکش اور منازعت ہے؟ جو جہری میں کم اور سری میں زیادہ ہونی چاہیے، کیونکہ جب جہری نماز میں قرأت میں مشغول ہوگا تو مقتدی کی قرأت کا امام پر اثر کم ہوسکتا ہے لیکن اگر نماز سری ہو تو مقتدی کی قرأت کا امام پر یقیناً زیدہ اثر ہوگا، غور کرنے کی بات ہے کہ جہری نماز میں ایک فرد کی سری قرأت کا یہ اثر ہوا کہ منازعت کی صورت پیدا ہوگئی اور آپ نے ناگواری کا بھی اظہار فرمایا، تو اگر سری نماز ہو اور مقتدیوں کی صف قرأت میں مشغول ہو تو پھر منازعت کتنی بڑھ جائے گی۔

اس تقابل سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ حضرت عبادہؓ کی تفصیلی روایت میں جو یہ آیا تھا کہ فجر کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی مقتدی کی قرأت سے گرانی ہوئی تو آپ نے

لاتفعلو الابفاتحة الکتاب ارشادفرمایا تھااوراس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے امام کے قرأت کوتو منع فرمادیا تھا،لیکن سورۂ فاتحہ کی قرأت کی اباحتِ مرجوحہ کے طور پر اجازت دی تھی، لیکن حضرت ابو ہریرہؓ کی مندرجہ بالا روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اباحت مرجوحہ بھی عارضی تھی جو برقرار نہیں رہی، کیونکہ اس روایت میں سورۂ فاتحہ کا بھی استثناء نہیں ہے اور ہر قرأت کوسبب منازعت قرار دے کر اظہار ناراضگی کیا گیا ہے اوراس کے نتیجہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ اس کے بعد جہری نمازوں میں تمام مقتدیوں نے قرأت خلف الامام کوترک کردیا۔

اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں جہری نماز میں ترک قرأت کی صراحت ہے،سری کی نہیں ہے،لیکن آپ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیت اذا قری القرآن الآیہ جہری اورسری دونوں کو عام ہے،اسی طرح حدیث اذا قرء فانصتوا بھی مقتدی کو خاموشی اختیار کرنے کی نصاً ہدایت کررہی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت میں بھی جو علت بیان کی جارہی ہے وہ منازعت اور کشمکش ہے جس کا تحقق جہری نمازوں سے زیادہ سری نمازوں میں ہوتا ہے،اس لیے اس روایت سے درجۂ اولیٰ میں سری نمازوں میں بھی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

اس روایت پر بھی طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے ہیں،ایک اعتراض تو یہ ہے کہ ابن اکیمہ لیثی مجہول راوی ہیں اس لیے روایت استدلال کے قابل نہیں،لیکن یہ اعتراض بھی اصولِ محدثین کے مطابق درست نہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن اکیمہ لیثی سے روایت کرنے والوں کی تعداد چار تک پہنچتی ہے جن میں ان کے پوتے عمر بن مسلم،امام زہری،سعید بن ابی ہلال اورابوالحویرث عبدالرحمٰن بن معاویہ شامل ہیں اور جس شیخ سے چار تلامذہ روایت کریں اس پر جہالت کا شبہ خلاف اصول ہے، دوسرے یہ کہ موطا کی مسند روایات پر کلام کرنا بھی جرأت بیجا معلوم ہوتی ہے اورتیسری بات یہ کہ ابنِ اکیمہ کوابوحاتم یحییٰ بن سعید اورابن حبان وغیرہ نے ثقات میں شمار کیا ہے اور بھی متعدد ائمہ سے ان کے بارے میں توثیقی کلمات منقول ہیں۔

دوسرااعتراض یہ کیا گیا ہے کہ فانتھی الناس عن القراء ۃ مع رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم الخ نہ پیغمبر علیہ السلام کا قول ہے اور نہ حضرت ابو ہریرہؓ کا یعنی یہ حدیث نہیں ہے بلکہ یہ تو امام زہری کا قول ہے اور دلیل یہ ہے کہ ابوداؤد وغیرہ میں اسی روایت کے بعض طرق میں **قال الزھری فاتعظ الناس فلم یکونوا یقرؤن** آیا ہے جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ امام زہری کا قول ہے۔

مگر یہ اعتراض بے سود معلوم ہوتا ہے، پہلی بات تو یہی ہے کہ یہ جملہ حضرت ابو ہریرہؓ کا ہے یہ ابوداؤد میں ابن ابی السرح کے حوالہ سے یہ بات حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے **قال معمر عن الزھری قال ابو ھریرۃ فانتھی الناس** اور یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ معمر کو **اثبت الناس فی الزھری** تسلیم کیا گیا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ جملہ امام زہری کا ہو تو اس سے مسئلہ پر فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ اصلی روایت تو **مالی انازع القرآن** پر ختم ہوگئی، اب آگے بیان کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے ارشاد کا صحابہ پر اثر کیا ہوا۔ یہ بات حضرت ابو ہریرہؓ فرمائیں تو اور امام زہری فرمائیں تو معنی ایک ہی ہیں کہ تمام صحابہ نے یہ عمل ترک کر دیا تھا، امام زہری کی طرف انتساب سے بھی اہمیت کم نہیں ہوتی کیونکہ زہری کی پیدائش ۵۸ھ کی ہے، وہ جلیل القدر تابعین میں ہیں، ان کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کو لکھا تھا **علیکم بابن شھاب فانکم لاتجدون احدا اعلم بالسنۃ الماضیۃ منہ**. ابن شہاب کے دامن کو مضبوطی سے تھام لو کہ تمہیں ان سے زیادہ سنتِ ماضیہ کا جاننے والا کوئی نہیں ملے گا اور ابن شہاب جب سنتِ ماضیہ کے سب سے بڑے عالم ہیں تو ان کا صحابہ کے بارے میں یہ خبر دینا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد سب نے قرأت خلف الامام کا عمل ترک کر دیا تھا۔ نہایت مضبوط دلیل ہے۔

حدیث پاک کے ذخیرہ میں قرأت خلف الامام کی ممانعت کے لیے اور بھی بہت روایات ہیں مگر ہم انھی تین روایت پر اکتفا کر رہے ہیں اور اسی مختصر بحث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت عبادہؓ کی روایت پر احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ **لمن لم یقرء** کے عموم میں مقتدی کو شامل کرنا غلط ہے، اب اس کے بعد منصفانہ ... ہ کے لیے قائم کردہ بنیادوں کے نقطۂ سادس پر مختصر گفتگو شروع کی جاتی ہے۔

(۶) رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم حیاتِ طیبہ میں ہمیشہ نمازوں کی امامت فرماتے رہے، مقتدی بن کر نماز پڑھنے کی نوبت شاذونادر پیش آئی، مگر عجیب بات ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری نمازِ باجماعت جو مرض الوفات کے درمیان پڑھی گئی، اس کی تفصیلات سے مقتدی پر فاتحہ کا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا اختصار یہ ہے کہ مرض الوفات نے جب شدت اختیار کرلی تو مسجد نبوی میں حضرت ابوبکر صدیق کو نماز پڑھانے کا حکم دے دیا گیا، وہ برابر نماز پڑھاتے رہے، ایک دن ظہر کی نماز میں آپ نے مرض میں تخفیف محسوس فرمائی تو دو آدمیوں کے سہارے سے آپ مسجد میں تشریف لائے، نماز حسب معمول شروع ہو چکی تھی، غور فرمایئے کہ ابتداءً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ نماز میں شرکت کا نہیں تھا اور نہ اس کی کوئی امید تھی، ورنہ یقیناً انتظار کیا جاتا۔ بخاری ہی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں وجد رسول اللہ ﷺ فی نفسہ خفة فخرج فاذا ابوبکر یؤم الناس (ص۹۴) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض میں تخفیف محسوس کی تو باہر آئے، دیکھا تو ابوبکر نماز میں امامت کر رہے ہیں۔ منشا عرض کرنے کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے کا ارادہ نماز شروع ہونے کے بعد فرمایا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگرچہ حجرۂ مبارک بہت قریب ہے، لیکن بیماری کی وجہ سے آپ خود نہیں چل پا رہے ہیں، دو آدمیوں کے سہارے سے آ رہے ہیں، اور پیر اٹھانا دشوار ہو رہا ہے روایت میں آتا ہے رجلاہ تخطان الارض کہ پیروں سے زمیں پر خط کھنچ رہا تھا، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں حجرہ سے مسجد تک جانے میں اتنا وقت ضرور صرف ہو گیا ہوگا کہ حضرت ابوبکرؓ سورۂ فاتحہ پڑھ چکے ہوں گے، اور ابن ماجہ وغیرہ کی صحیح روایت میں اس قرأت کی یہ تفصیل آ رہی ہے۔

واخذ رسول اللہ ﷺ من القراءة من حیث کان بلغ ابوبکر۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرأت وہاں سے شروع کی جہاں تک ابوبکر پہنچ چکے تھے۔

یہ روایت ابن ماجہ (ص۸۷) مسند احمد، بیہقی اور طحاوی وغیرہ میں ہے۔ مسند احمد کی

ایک روایت کے الفاظ میں فقرا من المکان الذی بلغ ابوبکر من السورة (جلدا، ص۲۰۹) ہے، سورت سے مراد اگر سورۂ فاتحہ کے علاوہ ہے تو گویا فاتحہ کی قرأت کے بعد دوسری سورۃ شروع ہو چکی تھی اور اگر سورت سے مراد فاتحہ ہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورہ فاتحہ کے ایک حصہ کی قرأت ہو چکی تھی۔ بہرحال اس نماز میں جو بظاہر مقتدی بن کر شروع ہوئی تھی اور فوراً ہی استخلاف کی صورت پیش آ گئی، اور آپ امام بن گئے، اس نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فاتحہ کی قرأت درمیان سے شروع کی یا سورۂ فاتحہ کے بعد کسی اور سورۃ کو درمیان سے پڑھا، اس سے یہ ثابت ہوا کہ امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے اور مقتدی پر بذاتِ خود فاتحہ کی قرأت واجب نہیں ہے۔

مدرکِ رکوع سے استدلال

پھر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آخری عمل، بالکل وہی ہے جس کی آپ پہلے تعلیم بھی دے چکے ہیں کہ اگر مقتدی نے امام کے قرأت سے فارغ ہونے کے بعد نماز میں شرکت کی اور امام کے ساتھ رکوع کی حالت میں شریک ہو گیا تو اس کی یہ رکعت صحیح اور مکمل ہے، ایسا نہیں ہے کہ فاتحہ کے ترک کی بنیاد پر اس رکعت کو شمار نہ کیا جائے، اس کے ثبوت کے لیے متعدد احادیث ہیں، ہم بخاری، ابوداؤد اور ابن خزیمہ کی ایک ایک روایت ذکر کررہے ہیں۔ بخاری کی روایت یہ ہے۔

عن ابی بکرة انه انتهی الی النبی ﷺ وهو راکع فرکع قبل ان یصل الی الصف فذکر ذلک للنبی صلی الله علیه وسلم فقال زادک الله حرصا ولاتعد. (بخاری جلد ۱، ص۱۰۸)

حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ایسی حالت میں پہنچے کہ آپ رکوع میں جا چکے تھے تو ابوبکرہ نمازیوں کی صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع میں چلے گئے اس بات کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا، خدا تمھاری اس حرص میں اضافہ کرے، اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔

یہ الفاظ تو بخاری کی روایت کے ہیں، دوسری کتابوں میں حضرت ابوبکرہؓ کی نماز میں شرکت کی جو تفصیلات ہیں وہ یہ ہیں کہ حضرت ابوبکرہؓ نے رکوع میں شرکت کے لیے تیز چلنا

شروع کیا تو ان کا سانس پھول گیا، اور وہ صف سے پہلے ہی رکوع میں چلے گئے، اور اسی حالت میں چل کر صف سے جا ملے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ سانس کس کا پھول رہا تھا تو ابو بکرہ نے جواب دیا خشیت ان تفوتنی الرکعة معک، مجھے یہ اندیشہ تھا کہ آپ کے ساتھ میری رکعت فوت نہ ہو جائے یعنی اس وجہ سے میں نے تیز گامی اختیار کی اور سانس پھول گیا۔

اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ حضرت ابو بکرہؓ نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اور رکوع میں شریک ہو گئے، اور دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جذبہ کی تحسین تو فرمائی کہ خدا تمھاری حرص عبادت میں اضافہ فرمائے، مگر یہ نہیں فرمایا کہ تمھاری نماز نہیں ہوئی۔ صرف یہ فرمایا کہ آئندہ ایسا نہ کرنا کہ تیز چل کر آؤ، یا آئندہ ایسا نہ کرنا کہ صف سے پہلے ہی رکوع میں چلے جاؤ وغیرہ چنانچہ امام بخاری نے بھی حضرت ابو بکرہ کی روایت (ص ۱۰۸) پر جو عنوان دیا ہے اس میں نماز کے صحیح نہ ہونے کی صراحت نہیں کی، عنوان ہے اذا رکع دون الصّف، کہ نمازی صف سے پہلے ہی رکوع میں چلا جائے تو کیا حکم ہے؟ قرأت خلف الامام کے سلسلے میں بخاری کے ذوق کا تقاضہ تو یہی تھا کہ وہ اس صورت میں نماز کے صحیح نہ ہونے کی تصریح کریں، مگر دلیل نے ساتھ نہیں دیا اس لیے فیصلہ کن بات نہ کہہ سکے، اس ترجمۃ الباب کے بارے میں گفتگو اپنے موقع پر آئے گی، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ امام بخاری کے نزدیک بھی یہی ثابت معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکرہؓ کی اس نماز کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔

امام بخاری کی روایت پر مختصر گفتگو کے بعد اب اس سلسلے میں ابو داؤد کی روایت دیکھیے جس میں مدرک رکوع کو صراحت کے ساتھ رکعت کا مدرک قرار دیا گیا ہے۔

عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جئتم الی الصلاة ونحن سجود فاسجدوا ولاتعدو ھاشینا ومن ادرک الرکعة فقد ادرک الصلاة۔ (ابوداؤد جلد ا، ص ۱۲۹)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم ایسی حالت میں نماز کے لیے آؤ کہ ہم سجدہ میں ہوں تو سجدہ میں چلے جاؤ اور اس کو بالکل شمار نہ کرو، اور جس نے رکوع کو پالیا تو بیشک اس نے نماز کو پالیا۔

صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت اور زیادہ صریح ہے اور ابن خزیمہ نے اس پر عنوان قائم کیا ہے **باب ذکر الوقت الذی یکون فیہ الماموم مدرکا للرکعة اذا رکع امامه قبل** کہ اگر امام رکوع میں چلا جائے تو مقتدی کو کس وقت تک مدرک رکعت مانا جائے گا۔

عن ابی هریرة مرفوعا من ادرک رکعة من الصلاة فقد ادرکها قبل ان یقیم الامام صلبه (صحیح ابن خزیمہ جلد ۳، ص ۴۵)

حضرت ابو ہریرہؓ مرفوعاً نقل کرتے ہیں کہ جس شخص نے امام کے سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے نماز میں رکوع کو پالیا تو اس نے نماز کو پالیا۔

یہ دونوں روایتیں، مقتدی کے رکوع میں امام کو پالینے کی صورت میں نماز کی تمامیت کو بتاتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مقتدی فاتحہ کی قرأت نہیں کرسکتا، اس لیے اب ان روایات پر کلام شروع ہوگیا، امام بخاری نے **جزء القراءة** میں کچھ راویوں پر جرح کردی، قاضی شوکانی نے کہا کہ **من ادرک الرکعة** میں رکعت سے مراد رکوع نہیں، پوری رکعت ہے وغیرہ۔

لیکن ہمارا استدلال اس بنیاد پر ہے کہ ابوداؤد نے اپنی کتاب میں روایت ذکر فرمائی ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ روایت میں زیادہ کمزوری ہوتی ہے تو وہ سکوت نہیں کرتے، روایت ذکر کرکے سکوت اختیار کرنا ابوداؤد کے اصول کے مطابق روایت کے قابلِ استدلال ہونے کی دلیل ہے نیز یہ کہ امام منذری نے بھی سکوت اختیار کیا ہے، اور یہ کہ یہ روایت مستدرکِ حاکم میں بھی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ذہبی نے حاکم کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے۔ یہ باتیں روایت کے قابلِ قبول ہونے کے لیے کافی ہیں اور امام بخاری کی جرح کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے مگر تفصیل کا موقع نہیں۔

اسی طرح قاضی شوکانی کا اعتراض بھی انصاف سے بہت دور ہے، حدیث پاک میں دسیوں جگہ **الرکعة** رکوع کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، خصوصاً اگر کسی روایت میں لفظِ سجدہ کے ساتھ رکعة کا لفظ استعمال کیا جائے تو وہاں رکوع کے معنی متعین ہوجاتے ہیں، نیز یہ کہ قاضی شوکانیؒ پہلے تو اس کے قائل تھے کہ مدرکِ رکوع، مدرک صلوٰۃ نہیں ہے اور اس کو یہ رکعت قضا کرنا ہوگی لیکن انھوں نے ''الفتح الربانی'' میں جو ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، اس

قول سے رجوع کرلیا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ مدرک رکوع کے مدرک رکعت قرار دیئے جانے پر روایات صراحت سے دلالت کررہی ہیں، اسی لیے جمہور یعنی امام اعظمؒ، امام مالکؒ امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام ثوریؒ، امامؒ اوزاعی اور ابوثورؒ وغیرہ کا مسلک بھی ہے کہ مدرک رکوع کی رکعت شمار ہوگی، صحابۂ کرام میں حضرت علیؓ حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید اور حضرت ابن عمرؓ سے بھی یہی منقول ہے۔

منصفانہ جائزے کی بنیادوں کے نقطۂ سادس پر کی گئی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری عمل اور مدرک رکوع کے بارے میں آنے والی روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی پر فاتحہ کی قرأت واجب نہیں تو حضرت عبادہؓ کی روایت میں لمن لم یقرء کے عموم میں مقتدی کو کیسے شامل کیا جاسکتا ہے؟ اب اس کے بعد نقطۂ سابع پر مختصر گفتگو کا آغاز کیا جاتا ہے۔

(۷) صحابۂ کرامؓ کے آثار

اختلافی مسائل میں صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا ایک آسان اور معتبر طریقہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کے آثار اور ان کے اقوال و اعمال کو دیکھا جائے کیونکہ امتِ محمدیہ کی یہ مقدس جماعت، پیغمبر علیہ السلام کی اولین مخاطب اور آپ کے منشاء کو صحیح طور پر سمجھنے والی ہے اور آپ نے امت کو ان کی پیروی کا حکم دیا ہے۔

جمہور صحابہ سے کثرت کے ساتھ ترکِ قرأت خلف الامام کے آثار صحیح اور حسن سندوں کے ساتھ منقول ہیں، علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ اسّی صحابہ کرام سے ترکِ قرأت خلف الامام ثابت ہے، امام شعبیؒ کا مقولہ صاحب روح المعانی نے نقل کیا ہے۔ ادرکت سبعین بدریا کلھم یمنعون المقتدی عن القراءۃ خلف الامام، میں نے غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والے ستر صحابہ کو پایا ہے اور وہ سب قرأتِ خلف الامام سے منع فرماتے تھے۔ امام محمد نے موطا میں لکھا ہے لا قرأۃ خلف الامام فیما جھر بہ وفیما لم یجھر بذلک جاءت عامۃ الآثار، امام کے پیچھے جہری یا سری کسی نماز میں قرأت نہیں ہے اور صحابۂ کرام اور تابعین کے آثار سے عموماً یہی ثابت ہوتا ہے یہاں ان آثار میں سے نمونہ کے طور پر چند کو پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حضرت زیدؓ بن ثابت کا اثر

سب سے پہلے حضرت زیدؓ بن ثابت کا اثر ملاحظہ کیجیے جو مسلم شریف میں ہے۔

عن عطاء بن یسار انه سال زید بن ثابت عن القراءة مع الامام فقال لاقراءة مع الامام فی شئی۔ (مسلم شریف جلد ۱ ص ۲۱۵)

عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ انھوں نے زید بن ثابت سے قرأت خلف الامام کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ امام کے ساتھ کسی بھی نماز میں قرأت نہیں ہے۔

مسلم کی روایت ہے سند بالکل صحیح ہے، امام نووی کو بھی کہنا پڑا کہ یہ امام ابوحنیفہ کا مستدل ہے مگر اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ صحیح روایت میں **لا صلوة لمن یقرء بام القرآن** آرہا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، حضرت زید وغیرہ کے قول پر مقدم ہے اور دوسرا جواب یہ کہ حضرت زید کا قول، جہری نماز میں **مازاد علی الفاتحه** پر محمول ہے۔ (نووی ص ۲۱۵ باختصار)

مگر ان دونوں جوابات کی کمزوری ظاہر ہے، کیونکہ بحث ہی یہ ہے کہ **لمن لم یقرء** کے ظاہری اور مجمل عموم کو صحابۂ کرام کیا سمجھ رہے ہیں؟ اگر اس روایت میں مقتدی کی صراحت ہوتی تب تو یہ بات درست تھی کہ حضرت زیدؓ کا قول، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ٹکرا گیا، اس کو ترک کر دیا جائے، یہاں تو یہ صورت ہے کہ آپ جو **لمن لم یقرء** کو عام سمجھ رہے ہیں، صحابۂ کرام کے آثار سے اس کی تائید نہیں ہوتی، نیز یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے **اذا قرء فانصتوا** بہ سندِ صحیح ثابت ہے تو حضرت زید کا قول ٹکرا رہا ہے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہے۔

اسی طرح دوسرا جواب کہ اس قول کو "مازاد" پر محمول کیا جائے، قطعاً قابلِ قبول نہیں، حضرت زیدؓ کے ارشاد میں اس کے لیے نہ صرف یہ کہ کوئی اشارہ نہیں، بلکہ **لاقراءة مع الامام فی شئی** کا یہ مطلب نکالنا انصاف سے دور ہے اور گلوخلاصی کی کوشش سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ کیا حضرت عطاء نے "مازاد علی الفاتحہ" کے بارے میں سوال کیا تھا؟ کہ جواب کو اس پر محمول کیا جائے۔

حضرت ابن عمرؓ کا اثر

اصح الاسانید سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اثر موطا امام مالک میں ان الفاظ میں

منقول ہے۔

مالک عن نافع ان عبداللہ بن عمر کان اذاسئل ھل یقرء احد خلف الامام؟ قال اذا صلّی احدکم خلف الامام فحسبہ قراءۃ الامام واذا صلی وحدہ فلیقرأ وکان عبداللہ بن عمر لایقرء خلف الامام (موطاامام مالک ص۲۹)

امام مالک، بواسطۂ نافع حضرت عبداللہ بن عمر سے نقل کرتے ہیں کہ ابن عمر سے جب یہ پوچھا جاتا کہ کیا کسی کو امام کے پیچھے قرأت کرنی چاہیے؟ فرماتے کہ جب تم میں سے کوئی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کو امام کی قرأت کافی ہے اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرأت کرے، اور خود عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔

اصح الاسانید سے آنے والے اس اثر کے مقابل بہ سند حسن کچھ ایسے آثار پیش کیے جاتے ہیں جن میں نماز میں قرأت کا ذکر ہے جیسے بیہقی نے نقل کیا ہے کہ ابوالعالیہؒ نے مکہ میں حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا اقرأ فی الصلوۃ، نماز میں قرأت کروں؟ تو ابن عمر نے فرمایا۔ انی لاستحیی من رب ھذہ البنیۃ ان اصلی صلوۃ لااقرء فیھا ولوبام القرآن، کہ مجھے خانۂ کعبہ کے پروردگار سے حیا آتی ہے کہ میں ایسی نماز پڑھوں جس میں قرأت نہ ہو، اگرچہ وہ سورۂ فاتحہ ہی ہو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی سند، موطا مالک کی سند کے مقابل پیش نہیں کی جاسکتی، دوسرے یہ کہ اس اثر میں خلف الامام قرأت کا ذکر نہیں ہے، پھر اس کو مقابلہ میں پیش کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے، حضرت عبداللہؓ بن عمر کے اثر میں جہری اور سری کی بھی تفصیل نہیں، وہ تو امام کے پیچھے ہر حال میں حسبہ قراءۃ الامام فرمارہے ہیں۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا اثر

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کے اثر سے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ مضمون ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کو پڑھنے کے تاکیدی حکم سے مقتدی مستثنیٰ ہے، یہ اثر موطا مالک، ترمذی اور طحاوی وغیرہ میں ہے اور ترمذی نے اس کو حدیث حسن صحیح بھی کہا ہے۔

مالک عن ابی نعیم وھب بن کیسان انہ سمع جابر بن عبداللہ یقول: من صلّی رکعۃ لم یقرء فیھا بامّ القرآن فلم یصل الاوراء الامام۔
(موطاامام مالک ص۲۸)

امام مالک، ابونعیم، وہب بن کیسان سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے جابر بن عبداللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے نماز کی کوئی رکعت پڑھی اور اس میں ام القرآن کو نہیں پڑھا تو اس نے نماز نہیں پڑھی، الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔

اس اثر سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کی قرات سے مقتدی مستثنیٰ ہے اور یہ کہ جن روایتوں میں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے جس سے فقہاء کرام نے اپنے اپنے اصول کے مطابق وجوب یا رکنیت کو ثابت کیا ہے، وہ سب غیر مقتدی یعنی امام و منفرد پر محمول ہیں جیسا کہ آپ پہلے امام احمد بن حنبل اور سفیان کے بارے میں جان چکے ہیں، هذا لمن یصلی وحده.

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اثر

حضرت عبداللہ بن مسعود سے حدیث کی مختلف کتابوں میں قرأت خلف الامام کی ممانعت پر آثار منقول ہیں، موطا امام محمد کے الفاظ یہ ہیں۔

قال محمد اخبرنا سفیان الثوری حدثنا منصور عن ابی وائل عن عبدالله بن مسعود قال انصت للقراءة فان فی الصلوة شغلا و سیکفیک الامام۔ (موطا امام محمد ص ۱۰۰)

امام محمد نے کہا کہ ہم سے سفیان ثوری نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ ہم سے منصور نے بواسطہ حضرت ابووائل، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بیان کیا، انھوں نے فرمایا، امام کی قرأت کے وقت انصات اختیار کرو اس لیے کہ نماز میں خاص مشغولیت ہوتی ہے اور تمھارے لیے امام کافی ہے۔

سند بالکل صحیح ہے، اور ارشاد کا مطلب بھی بالکل صاف ہے کہ مقتدی کے لیے انصات واجب ہے اور امام کی قرأت اس کے لیے کافی ہے۔

اسی طرح کے آثار خلفا راشدین یعنی حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں جن کو حدیث کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے، اسی طرح تابعین کرام سے بھی متعدد آثار نقل ہیں مگر ہم صرف صحابہ کرام سے چند آثار نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

قرأت خلف الامام کی مذمت کے آثار

البتہ یہ بات واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرأت خلف الامام سے جہاں ممانعت کے آثار منقول ہیں وہیں کچھ اکابر صحابہ سے قرأت خلف الامام پر سخت نکیر اور مذمت پر مشتمل آثار بھی ثابت ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة (دارقطنی جلد۱،ص۱۲۶)

جس نے امام کے پیچھے قرأت کی، اس نے فطرت کی خلاف ورزی کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

ان عمر بن الخطاب قال لیت فی فم الذی یقرء خلف الامام حجرا۔
(موطا امام محمد ص۱۰۲)

حضرت عمر بنؓ خطاب نے فرمایا، جو شخص قرأت خلف الامام کا عمل کرتا ہے کاش اس کے منہ میں پتھر ڈال دیے جائیں۔

حضرت سعد بنؓ ابی وقاص سے منقول ہے۔

وددت ان الذی یقرء خلف الامام فی فیه جمرة۔ (موطا امام محمد ص۱۰۲)

میری خواہش یہ ہے کہ جو قرأت خلف الامام کرتا ہے، اس کے منہ میں انگارے ہوں۔

ان حضرات کے علاوہ قرأت خلف الامام پر اسی طرح کی مذمت کے آثار حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض اکابر تابعین سے منقول ہیں، ان آثار کی چونکہ کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی اس لیے حضراتِ صحابہ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ سخت کلمات سن کر قرأت خلف الامام کرنے والوں کو غصہ آتا ہے اور اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ملتی کہ آثار کا انکار کر دیا جائے۔ امام بخاری نے بھی ایسا ہی راستہ اختیار فرمایا ہے۔

امام بخاریؒ کا تبصرہ اور اس کی حقیقت

امام بخاریؒ نے بھی جزء القراءۃ خلف الامام میں یہی راستہ اختیار فرمایا ہے کہ پہلے اس طرح کے بعض آثار نقل فرمائے، پھر اس کا جواب اس طرح دیا۔

(۱) بعض راویوں پر جرح کر دی، گویا ان آثار کا ثبوت ہی مشکوک ہو گیا۔

(۲) پھر یہ فرمایا کہ اس طرح کا کلام اہلِ علم کا نہیں ہو سکتا اور اس کے متعدد وجوہ ہیں۔

(الف) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لا تلاعنوا بلعنة الله ولا بالنار ولا تعذبوا بعذاب الله، ایک دوسرے کو اللہ کی رحمت سے دوری اور جہنم کی بددعائیں نہ دو، اور اللہ کے عذاب (آگ) کی کسی کو سزا نہ دو۔ اوران سخت الفاظ میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، اس لیے یہ اہلِ علم کے الفاظ نہیں ہوسکتے۔

(ب) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ جرأت کون کرسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے منہ میں انگارے بھرنے کی (نعوذ باللہ) خواہش کرے۔

(ج) جب قرأت خلف الامام کی حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوگئی تو اب دوسروں کی بات میں کیا حجت ہے؟ (جزء القرأة ص ۱۲)

مگر امام بخاری رحمہ اللہ کے یہ تمام ارشادات محلِ نظر ہیں، جہاں تک راویوں پر جرح کی بات ہے تو حقیقت یہ ہے کہ جن راویوں پر جرح کی گئی ہے، انھیں راویوں کی بعض ائمہ سے توثیق بھی منقول ہے پھر یہ کہ یہ تمام آثار ایک سند سے نہیں آرہے ہیں بعض آثار کئی کئی سندوں سے ثابت ہیں، موطا امام محمد، مصنف عبدالرزاق اور طحاوی شریف جزء القرأة للبیھقی اور دوسری کتابوں میں ان کی سندوں کو دیکھا جاسکتا ہے، انصاف پیش نظر ہوتو محدثین کے اصول کے مطابق سرے سے انکار کردینے کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل ہے۔

اسی طرح امام بخاری نے ان آثار کے اہل علم کا کلام نہ ہونے کی جو وجوہ بیان کی ہیں، وہ بھی ناقابلِ فہم ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاری یہ فرض کرکے بحث کررہے ہیں کہ قرأت خلف الامام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ کسی کے انکار کردینے سے کیا ہوتا ہے؟ حالانکہ جمہور کے نزدیک صورتِ حال یہ ہے کہ قرأتِ خلف الامام کے ثبوت کے لیے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام سے صراحت کے ساتھ کچھ منقول نہیں، اور ممانعت پر احادیث صحیحہ میں بہت کچھ منقول ہے اور اسی ممانعت کی تائید میں یہ آثار موجود ہیں۔

اس لیے اگر قرأت خلف الامام پر نکیر کرتے ہوئے کسی کی زبان سے سخت الفاظ نکلے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس حکم خداوندی اور حکم رسالت کی خلاف ورزی نہ کرتا تو بہتر تھا، خواہ اس خلاف ورزی سے بچنے میں اس کو کچھ دنیاوی تکلیف برداشت کرنا پڑتی مثلاً

منہ میں مٹی یا انگارے ہوتے تو اس کی وجہ سے وہ قرأت خلف الامام سے باز رہتا۔
پھر یہ کہ ان آثار میں آگ کی سزا بالفعل کہاں دی جارہی ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس فعل کی قباحت بیان کرنے کے لیے ایسی خواہش کا اظہار کیا جارہا ہے، پھر کہنے والے کے تصور میں کیا ضروری ہے کہ اس کا مصداق صحابۂ کرام ہوں؟ ابراہیم نخعی سے موطا امام محمد میں منقول ہے ان اول من قرء خلف الامام رجل انھم (ص ۱۰۰) قرأت خلف الامام کرنے والے پہلے شخص کو متہم قرار دیا گیا یعنی اس کو بدعت کی طرف منسوب کیا گیا، طحاوی میں ابن عباسؓ سے منقول ہے، لو کان لی علیھم سبیل لقلعت السنتھم جلد۱، ص ۱۲۱) قرأت خلف الامام کرنے والوں پر میرا بس چلے تو میں ان کی زبان کھینچ لوں یقینی بات ہے کہ اس طرح کے سخت کلمات کہنے والوں کے علم میں امام بخاری کی طرح یہ بات ہوتی کہ یہ عمل بعض صحابۂ کرام بھی کررہے ہیں تو وہ اتنی سخت بات نہ کہتے۔

علامہ ابن تیمیہؒ کا جواب

علامہ ابن تیمیہ نے امام بخاری کے اس تبصرے پر فتاویٰ میں کلام کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس طرح کے آثار، ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو امام کی قرأت کو سن رہے ہوں اور اس کے باوجود وہ اپنی قرأت جاری رکھے ہوئے ہوں، کہ یہ لوگ ان ہی حضرات کی طرح ہیں جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مالی انازع القرآن، یا علمت ان بعضکم خالجنیھا فرمایا ہے، اس لیے اگر کسی کی تحقیق یا اعتقاد یہ ہو کہ امام کی قرأت کو سننے کے وقت، مقتدی کا خود قرأت کرنا، اللہ اور اس کے رسول کی معصیت ہے اور ایسا کرنے والا امر خداوندی کا تارک اور نہی خداوندی کا مرتکب ہے تو اس کے بارے میں یہ کہنا جائز ہے کہ اس کے منہ میں کوئی ایسی تکلیف ہوجاتی جس سے وہ معصیت سے محفوظ ہوجاتا، کیونکہ مبتلائے تکلیف ہونا، مبتلائے معصیت ہونے سے اہون اور کمتر ہے، یہ بالکل اس طرح کی بات ہے جیسے کلمۂ حرام زبان سے ادا کرنے والے کے بارے میں کہہ دیا جائے لو کنت اخرس لکان خیر الک، تم گونگے ہوتے تو اس سے بہتر تھا۔
پھر کچھ بحث کرنے کے بعد ابن تیمیہ نے فرمایا کہ ان آثار میں لعنت یا تعذیب نہیں ہے، صرف اس کی خواہش کا اظہار ہے کہ یہ ایسی چیز میں مبتلا ہوجاتا جو اس کو معصیت کے

ارتکاب سے روک دیتی اور ظاہر ہے کہ عملاً سزا دینے، اور سزا کی خواہش کا اظہار کرنے میں بہت فرق ہے، نیز یہ کہ حضرت علیؓ اور حضرت صدیق اکبرؓ نے بعض مرتدین کو آگ میں جلانے کی سزا بھی دی ہے، ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ اقدام تعذیب بالنار سے ممانعت والی روایات کی تاویل کے بعد کیا ہوگا، پھر جب تاویل کے بعد اقدام کرنا بھی جائز ہے تو گناہ میں مبتلا اور معصیت کے مرتکب کے بارے میں تعذیب بالنار کی خواہش پر مشتمل الفاظ استعمال کرنا بدرجہ اولیٰ ممنوع نہ ہونا چاہیے۔ (فتاوی ابن تیمیہ جلد ۲۳، ص ۳۰۶)

امام بخاری کے تبصرے کا حاصل تو یہ تھا کہ ان آثار کا انکار کردیا جائے اور ابن تیمیہ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ انکار کے لیے امام بخاری کے ذکر کردہ دلائل ناکافی ہیں اور قرأت خلف الامام کے سلسلے میں اس طرح کے سخت کلمات کے ذریعہ اظہار ناپسندیدگی مستبعد بات نہیں ہے اور جب ان آثار کی سند بھی قابلِ قبول ہے تو استبعاد یا انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

منصفانہ جائزے کے لیے قائم کردہ اس بنیاد پر بحث کرنے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام کے آثار واقوال سے مقتدی پر فاتحہ کے وجوب کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ صحیح اور اصح الاسانید سے آنے والے آثار سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقتدی کا فاتحہ پڑھنا یا کسی طرح قرأت کرنا جائز ہی نہیں ہے۔

اس موضوع سے فراغت کے بعد، اب منصفانہ جائزے کی آخری اور آٹھویں بنیاد۔ امامت واقتداء کے بارے میں شریعت کی عام ہدایات پر اختصار کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے۔

امامت واقتداء کے بارے میں شیخ الہندؒ کا ارشاد

اس موضوع پر حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ، بڑی مدلل اور فکر انگیز بحث فرماتے تھے، اختصار کے ساتھ سبق میں بھی بیان فرماتے اور اس کی تفصیل ان کی کتاب ایضاح الادلہ میں موجود ہے، ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں امامت کا موضوع الگ، اور اقتداء کا موضوع الگ ہے، اور امام ومقتدی کے بارے میں شریعت کی عام ہدایات اور احکام شرعیہ پر نظر کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ مقتدی کو قرأت کا حق نہیں ہونا چاہیے کیونکہ شریعت نے جماعت کی نماز کو مصلین کے تعدد کے باوجود متعدد نہیں مانا ہے، بلکہ اس کو صلوۃ واحدہ کا حکم دیا گیا ہے، آپ کا ارشاد ہے۔

لقد اعجبنی ان تکون صلوۃ المسلمین واحدۃ (ابوداؤد ص ۷۴)

مجھے یہ بات بہت پسند آئی کہ مسلمانوں کی نماز (باجماعت) صلوۃ واحدہ ہو۔

اور اس صلوۃ واحدہ میں احکام شرعیہ کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ امام صفت صلوۃ میں اصل، متبوع اور موصوف بالذات ہے اور مقتدی اس کا تابع اور موصوف بالعرض ہے، جیسے کشتی اور اس میں سوار ہونے والے افراد میں سیر و حرکت کی صفت مشترک ہے، مگر سیر اور حرکت سے کشتی موصوف بالذات ہے اور اس میں بیٹھنے والے موصوف بالعرض ہیں۔

چند احکام شرعیہ سے نظریہ کی وضاحت

احکام شرعیہ پر غور کرنے سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ نماز باجماعت میں امام کو اصل قرار دیا گیا ہے، اور مقتدی کو تابع کیا گیا ہے۔ مثلاً:

(۱) احادیث میں تصریح ہے کہ امام کو امتیازی اوصاف کا حامل ہونا چاہیے کہ وہ اعلم ہو اقرأ ہو وغیرہ، اس میں امام کے اصل اور موصوف بالذات ہونے کا واضح اشارہ ہے۔

(۲) احادیث میں صراحت ہے کہ مقتدیوں کو ارکان کی ادائیگی میں امام سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں لاتبادروا الامام الحدیث یاانّ الامام یرکع قبلکم و یرفع قبلکم، امام سے آگے مت بڑھو اور یہ کہ امام تم سے پہلے رکوع میں جائے گا اور تم سے پہلے اٹھے گا، یہ احکام اسی لیے ہیں کہ امام متبوع ہے، موصوف بالذات ہے، اور مقتدی تابع اور موصوف بالعرض ہیں۔

(۳) امام کو کوئی عذر مانع صلوۃ پیش آجائے تو فوراً استخلاف کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مقتدیوں کی نماز کو محفوظ رکھا جائے، اسی ضرورت کے سبب اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ صف اول میں اولو الاحلام والنہی کو رہنا چاہیے وغیرہ، جبکہ کسی مقتدی کو عذر پیش آنے کی صورت میں ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔

(۴) امام کی نماز صحیح ہے تو شرائط پوری کرنے والے تمام مقتدیوں کی نماز صحیح ہے، اور امام کی نماز میں فساد آجائے تو تمام نمازیوں کی نماز فاسد ہو جاتی ہے، اگر امام موصوف بالذات نہ ہوتا اور تمام مقتدیوں کو موصوف بالذات قرار دیا گیا ہوتا تو امام کی نماز کا فساد مقتدیوں کو

متاثر نہ کرتا۔

(۵) احادیث میں تصریح ہے کہ امام کا سترہ، تمام مقتدیوں کے لیے کافی ہے، اور مقتدی کا سترہ امام کے لیے کافی نہیں۔

(۶) حکم شرعی یہ ہے کہ امام کو سہو ہو جائے تو سجدۂ سہو میں تمام نمازیوں کو شرکت کا حکم ہے، یہ نہیں کیا جا سکتا کہ سہو تو امام کو ہوا ہے ہم سے کیا تعلق؟ یا اس کے برعکس صورت ہو کہ مقتدی کو سہو ہو جائے تو اس پر سجدہ سہو نہیں آتا، یہ واضح دلیل ہے کہ امام اصل اور موصوف بالذات ہے، مقتدی کو اس کا تابع بنایا گیا ہے۔

(۷) سجدۂ تلاوت میں بھی مقتدی کو امام کا تابع بنایا گیا ہے، فرض کیجیے کہ سرّی قرأت میں امام نے آیتِ سجدہ کی تلاوت کی، مقتدی نے سنا بھی نہیں، لیکن مقتدی کو امام کے ساتھ سجدۂ تلاوت کا پابند بنایا گیا ہے۔

(۸) احادیث میں ہدایت کی گئی ہے کہ مقتدی دو یا دو سے زیادہ ہوں تو امام کو آگے کھڑا ہونا چاہیے اذا کنا ثلثة ان یتقدمنا احدنا، یہ حکم بھی امام کے اصل اور موصوف بالذات ہونے کی وجہ سے ہے۔

(۹) مقتدیوں کا اجتماعی طور پر ضم سورت سے سبکدوش ہونا، مقتدی کے تابع اور موصوف بالعرض ہونے ہی کی وجہ سے ہے۔

(۱۰) مقتدی کے امام سے قبل اُٹھنے وغیرہ کے بارے میں احادیث میں ممانعت کی گئی ہے۔ الذی یرفع راسه و یخفضه قبل الامام فانما ناصیته بید الشیطان جو امام سے پہلے سر اُٹھائے یا جھکائے تو اس کی پیشانی شیطان ہی کے ہاتھ میں ہے، صاف ارشاد ہے کہ مقتدی تابع اور موصوف بالعرض ہے۔

ان ہی چند احکام پر انحصار نہیں، بلکہ امامت و اقتداء کے تمام احکام میں یہ بات قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ امام کی حیثیت، مقتدا، پیشوا، متبوع اور موصوف بالذات کی ہے اور مقتدی کو ہر اعتبار سے اس کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور شریعت نے جماعت کی نماز کو صلوٰۃِ واحدہ قرار دے کر نمائندگی کا حق صرف امام کو دیا ہے اور آداب کی بجا آوری میں مقتدی کو امام سے پیچھے رہنے کی ہدایت دی ہے۔

نمازِ باجماعت کی اس نظریہ کے مطابق تشریح

نماز کا معاملہ یہ ہے کہ اگر انسان منفرد ہو کر اس کو ادا کرتا ہے تو وہ خود نماز کے تمام ارکان کا ذمہ دار ہوتا ہے کیونکہ اس کا کسی سے کوئی ربط نہیں، لیکن اگر وہ منفرد نہیں ہے بلکہ اس نے کسی کو امام بنا کر اس کی اقتداء کو قبول کر لیا ہے تو کیا اس کی معیت کا صرف یہ فائدہ ہے کہ عمل کی جگہ ایک ہوگئی اور امام کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ اٹھنے اور بیٹھنے کا اشارہ دیا کرے اور بس، اور اگر امام کی حیثیت صرف اتنی ہی ہے تو پھر ان اوصاف کی کیا ضرورت ہے جن کی احادیث میں صراحت کی گئی ہے کہ امام کو اقرءُ لکتاب اللہ پھر اعلم بالسنۃ، پھر اقدمہم ھجرۃ وغیرہ ہونا چاہیے۔

ان قیود کا مطلب تو یہی ہے کہ امام کی حیثیت اصل اور متبوع کی ہے، حکومتوں کا دستور بھی یہی ہے کہ وہ کسی شخص کو سفیر اور نمائندہ کی حیثیت سے نامزد کرتے ہیں تو کسی ہوش مند اور باوجاہت شخص کا انتخاب کرتے ہیں، یہاں بارگاہِ خداوندی میں نمائندہ کو منتخب کرنے کی بات ہے تو اس کے لیے علم وعمل کے اعتبار سے پاکیزہ اوصاف کے حامل انسان کی ضرورت ہے جو اپنی اور دوسروں کی ذمہ داری کو خوبی کے ساتھ ادا کر سکے، اسی لیے **الامام ضامن** فرمایا گیا ہے وغیرہ۔

پھر جب نمائندہ کا انتخاب ہوگیا تو اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کو کس سلسلے میں نمائندگی دی گئی، جہاں تک آدابِ عبدیت یعنی قیام، رکوع، سجدہ اور قومہ کا تعلق ہے تو یہ سب چیزیں تو مقتدی خود بھی کر رہا ہے اور کرنا بھی چاہیے کہ کسی کے دربار میں حاضری کے وقت آداب کی بجا آوری میں نمائندگی نہیں ہوتی، آداب تمام حاضرین کو خود بجا لانے ہوتے ہیں، اگرچہ ان آداب میں بھی تقدم نمائندہ کو دیا جاتا ہے کہ وہ پہل کرتا رہے اور بقیہ حاضرین اس کے پیچھے چلتے رہیں البتہ ترجمانی کا حق کسی ہوشمند اور ذی وجاہت انسان کو دیا جاتا ہے اور حاضرین عرضِ حال میں خاموش رہتے ہیں۔

نماز کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس میں یہ ہے کہ پہلے دربارِ خداوندی میں حاضری کے لیے اعلان کیا جائے گا جس کی صورت اذان تجویز کی گئی ہے، پھر دربار میں حاضری کی شرائط بتلادی گئی ہیں کہ پاکی حاصل کرو، لباس پہنو وغیرہ، پھر نماز میں داخلہ کا ادب بتایا گیا ہے کہ

ہماری کبریائی اور عظمت وجلال کا اقرار کرتے ہوئے شریک ہوجاؤ، ہماری حمد وثنا کرو، اب حمد وثنا کے بعد عرض ومعروض اور مناجات کا وقت آیا جو تمام نماز میں اصل مقصود ہے اور جس پر حدیث میں الصلوۃ کا اطلاق کیا گیا ہے اس مناجات یعنی قرأت کی ذمہ داری امام کو تفویض کی گئی ہے اور جب یہ ذمہ داری امام کے سپرد ہوگئی اور اس نے تمام مقتدیوں کی جانب سے یہ بار اٹھالیا تو اب اگر مقتدی بھی قرأت کریں تو ایک طرف تو یہ آداب کی خلاف ورزی ہوگی اور دوسری طرف یہ کہ امام جو اصل اور متبوع ہے اس کی قرأت اکہری ہوگی اور مقتدی جو تابع ہے اس کی قرأت دوہری ہوجائے گی اس لیے مقتدی کو اس سے روک دیا گیا اور فرما دیا گیا۔ **یکفیک الامام** تمھارے لیے امام کافی ہے۔

اس مناجات کی تفصیل یہ ہے کہ امام تمام مقتدیوں کی جانب سے حمد خداوندی شروع کرتا ہے جس میں سب کی طرف سے **اھدنا الصراط المستقیم** کی درخواست ہے، جب امام مناجات کا ایک اہم حصہ ادا کرلیتا ہے تو سب کی طرف سے آمین کہلا کر اس کی تصدیق کرائی جاتی ہے کہ اے پروردگار ہم سب کا مقصد ایک ہی ہے، پھر خدا کی طرف سے **لعبدی ما سأل** کا انعام دیا جاتا ہے کہ بندوں کی درخواست مقبول ہے، پھر **اھدنا الصراط المستقیم** کے جواب میں جو کتاب ہدایت۔ **ذلک الکتاب لاریب فیه ھدی للمتقین** کی شان کے ساتھ نازل کی گئی ہے اس کے کسی حصے کے ذریعے سے مناجات شروع ہوجاتی ہے، مناجات کا فریضہ سب کی طرف سے امام ادا کرتا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جماعت میں ہر طرح کے انسان ہوتے ہیں، ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی درخواست کو رد نہیں کیا جاتا اور بعض کمزور بھی ہوتے ہیں لیکن وہ بھی اچھے لوگوں کے ساتھ شریک ہوکر قبولیت اور تقرب کے مستحق ہوجاتے ہیں۔

جب مناجات ختم ہوگئی اور قبولیت سے نواز دیا گیا تو اب پھر آداب کی تلقین کی گئی کہ تعظیم بجالاتے ہوئے ہماری بارگاہ میں جھک جاؤ، چنانچہ امام پیشوائی کرتے ہوئے رکوع میں چلا جاتا ہے تو سب رکوع میں چلے جاتے ہیں، رکوع سے اٹھتے وقت امام اطلاع دیتا ہے **سمع الله لمن حمده**، خدا نے حمد کرنے والوں کی حمد کو قبول کرلیا تو سب جواب دیتے ہیں **ربنا لک الحمد** اور جب بندے اس مختصر قیام میں بھی حمد کرتے ہیں تو مزید تقرب کے لیے اجازت ملتی ہے کہ سجدے میں چلے جاؤ، امام یہاں بھی پیشوائی کرتا ہے اور

فوراً یہ کیفیت طاری ہوتی ہے کہ تمام بندے امام کے فوراً بعد خدا کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں، پھر سجدے سے سر اٹھاتے ہیں، تحیات بجالاتے ہیں، درود وسلام پڑھتے ہیں اور تسلیمات کرتے ہوئے کامیاب واپس ہو جاتے ہیں۔

نماز کی اس تشریح کی بنیاد یہی احادیث ہیں کہ مثلاً حضرت عبادہؓ کی روایت میں لاصلوة لمن لم یقرء بها فرمایا گیا ہے تو جماعت کی نماز میں جو شخص اصل اور موصوف بالذات ہے اس کو قرأت فاتحہ کا ذمہ دار بنایا گیا اور حضرت جابرؓ کی روایت، من کان له امام فقراءة الامام قراءة له کے تقاضے میں جو لوگ تابع اور موصوف بالعرض تھے ان کو عمل قرأت سے روک دیا گیا اور اس کی پوری تفصیلات انما جعل الامام لیوتم به الحدیث میں آ گئیں، جس میں صاف طور سے ہدایت کردی گئی کہ آداب کی بجاآوری میں سب امام کی پیروی کریں اور مناجات کے عمل میں اذا قرء فانصتوا کے مطابق امام قرأت کرے اور مقتدی خاموش رہیں، اس طرح تمام روایات میں کوئی تعارض بھی نہیں رہتا۔ والعلم عند اللہ۔

منصفانہ جائزے کی اس بنیاد کے مرکزی مضامین حضرت شیخ الہندؒ کی تقریر سے لیے گئے ہیں اور ان سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت عبادہؓ کی روایت میں لمن لم یقرء کے عموم میں مقتدی کو شامل کرنا درست نہیں ہے۔

خلاصۂ مباحث

اس موضوع کی تفصیلات تو بہت ہیں اور سبق میں ان کا احاطہ ممکن نہیں لیکن الحمد للہ امام بخاری کے ترجمۃ الباب اور استدلال کے بارے میں جو باتیں عرض کرنی تھیں وہ پوری ہو گئیں، اور ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ امام بخاری کا ترجمۃ الباب کئی مسائل پر مشتمل تھا، جس میں سب سے اہم مسئلہ قرأت فاتحہ خلف الامام کا تھا، اور ترجمہ کے ذیل میں امام بخاری نے تین روایات پیش کی تھیں جن میں سے دو روایات کا تعلق امام ومنفرد سے تھا اور صرف حضرت عبادہؓ کی روایت کے بارے میں گمان ہوسکتا تھا کہ اس کے عموم میں مقتدی بھی شامل ہے، پہلے تینوں روایات کی تشریح کردی گئی، پھر حضرت عبادہؓ کی روایت کے عموم میں مقتدی کے شامل ہونے کے مسئلہ کو منقح کرنے اور اس سلسلے میں صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے بنیادی نکات متعین کیے گئے کہ روایت کے طرق کو دیکھا جن میں تفصیل واختصار کا

فرق تھا، مختصر روایت میں بھی الفاظ میں کمی وبیشی کا فرق تھا۔ پھر اس روایت میں پائے جانے والے صریح مضامین، اور واضح قرائن کو دیکھا، قواعد عربیت کی روشنی میں صحیح مطلب تک پہنچنے کی کوشش کی، اس روایت کے راویوں کے مسلک کو دیکھا، ان تمام داخلی مضامین پر تابمقدور گفتگو کے بعد خارجی دلائل میں قرآن پاک احادیث، اور آثار صحابہ کی روشنی میں مسئلہ کو سمجھا اور آخر میں امامت واقتداء کے بارے میں شریعت کی عام ہدایات اور احکام شرعیہ کی روسے غور کیا۔ اور ان تمام مباحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ حضرت عبادہ کی روایت میں لمن لم یقرء کے عموم میں مقتدی شامل نہیں ہے اور یہ روایت صرف امام ومنفرد سے متعلق ہے۔

لیکن ان تمام حقائق کے باوجود یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اگر چہ اس مسئلے میں اختلاف اولیٰ وغیر اولیٰ کا نہیں، واجب اور مکروہ تحریمی کا ہے لیکن اس مسئلہ میں قرنِ اوّل سے دورائے ہیں اس لیے تمام مسلمانوں کو اپنے ائمہ کے مسلک کے مطابق عمل کرنا چاہیے اور دوسرے فریق کے بارے میں تشدد اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

تیر والی آرٹ پرنٹرز دہلی۔۶ فون: 2943292

کمپوزنگ: نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی۔ فون: 2480273